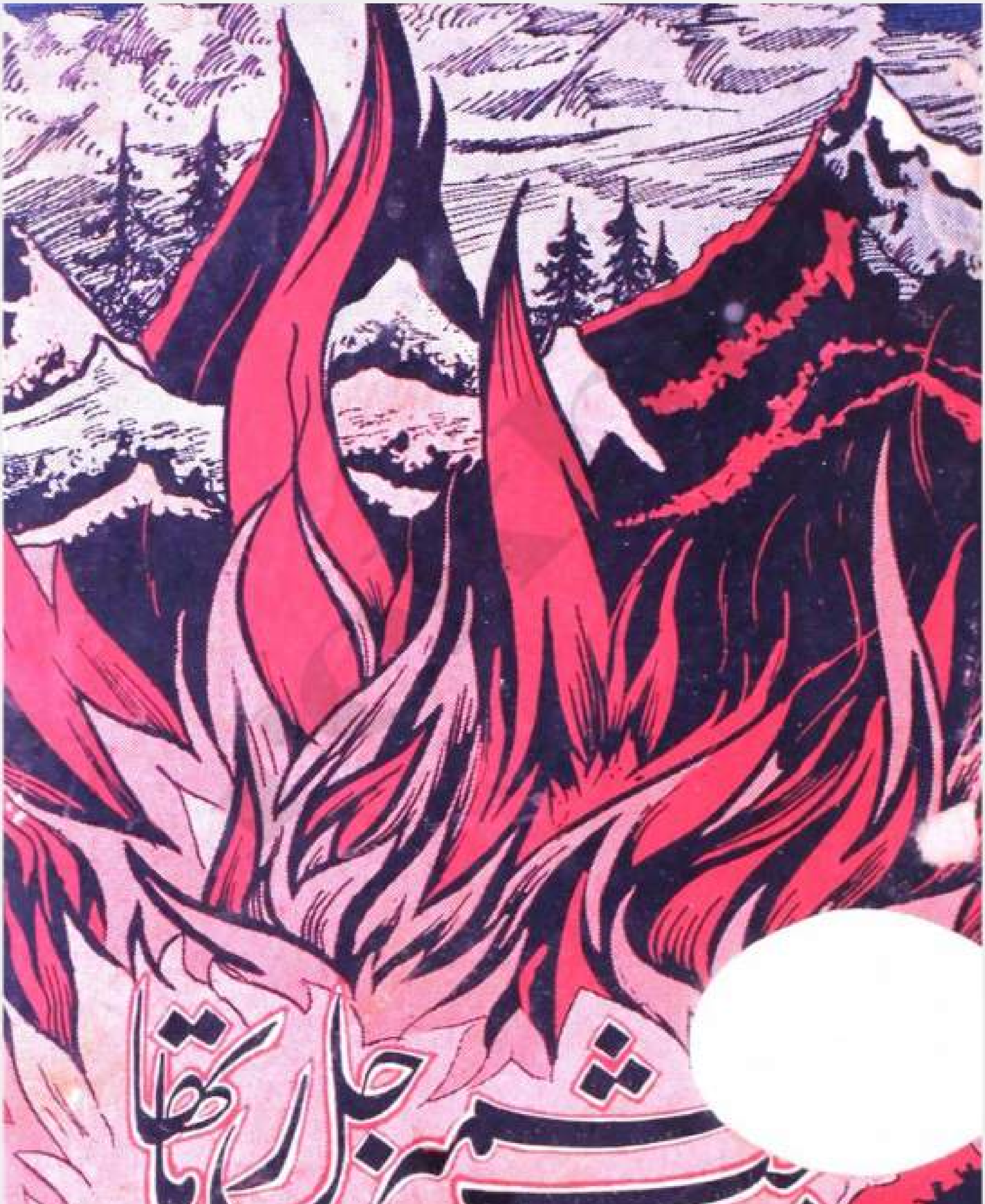

شمیر جل رہا تھا
کشمیری لال ذاکر

نئے کشمیر کے مستقبل کے نام

کشمیری لال ذاکر

پبلشرز :- حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

سول ڈسٹری بیوٹرز :-

مکتبہ شاعلیں کشمیری گیٹ دہلی

پرویز پرنٹر پبلشر نے الامان پریس دہلی سے طبع کرا کر حالی پبلشنگ ہاؤس
اردو بازار دہلی سے شائع کی

جب کشمیر جل رہا تھا

کشمیری لال ذاکر

فہرس

تعارف

ہندوستان کے چند باہمت ترقی پسند نوجوان ادیبوں نے ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ جس تحریک کا آغاز کیا تھا اس میں پہلے پہل تخریبی عناصر بہت زیادہ نمایاں رہے تھے۔ وہ بھی باغیانہ بیباکی کے ساتھ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کے ابتدائی دور میں ہی اس کے خلاف نہایت مضبوط محاذ قائم ہو گیا۔ حالانکہ جاننے والے بخوبی اندازہ لگا سکتے تھے کہ احتجاج اور بغاوت کے بادل چھٹنے کے بعد فنی نور اور حسن کی شعاعیں چاروں جانب پھیل جائیں گی لیکن وہ بادل چھٹنے بھی نہیں پائے تھے کہ ہندوستان کی سیاسی فضا ابر آلود ہو گئی۔ اور سرزمین ہندوستان کی کجروی اور بہیمیت کا ایسا ڈرامہ کھیلا گیا۔ جس کی نظیر تاریخ دنیا کے اوراق میں بھی شاید ہی مل سکے۔

ملک کی تقسیم سے پہلے ترقی پسند ادیبوں کا ایک مخصوص نقطہ نظر ضرور تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد دفعتہً ان پر جمود طاری ہو گیا۔ بیشتر ادیبوں نے چپ سادھ لی۔ غالباً وہ اس امر کا فیصلہ ہی نہ کر سکے۔ کہ وہ درحقیقت کہاں ہیں؟ اس ہیبت ناک ڈرامے کی بابت بہت کم ادیبوں نے کچھ لکھا ہے جب کہ اول کے بعض ادیب تو اس پہلو سے بالکل ہی خاموش رہے ہیں۔ ان پر یہ الزام بھی عائد ہو سکتا ہے کہ وہ اس سانحہ سے متاثر نہیں ہوئے۔

یہ تو ظاہر ہے۔ ان دردناک بلکہ شرمناک واقعات کا اصل سبب کانگریس اور لیگ کے نظریوں کا اختلاف تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی از خود ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ کانگریسیوں کے نقطہ نظر سے دیکھیے تو لیگ اس کی ذمہ دار ہے۔ اور لیگیوں کے نقطہ نظر سے کانگریس مورد الزام ٹھہرتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ مسلمانوں کو ان کے مکمل حقوق دیئے جانے کے حق میں تو تھے لیکن ملک کی تقسیم کے خلاف تھے (جن میں خود میں بھی شامل ہوں) وہ مسلم لیگ کی گمراہ کن، مذہب پرستانہ اور رجعت پسندانہ پالیسی ہی کو ان واقعات کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ البتہ بیشتر ذمہ دار سمجھتے ہیں یہ نتیجہ نکال لینے کے بعد ادیبوں کیلئے اور کچھ کہنے کیلئے نہیں رہ جاتا۔ جس عالمگیر انسانیت کے تصور پر ترقی پسند ادیبوں کی اساس قائم کی تھی۔ یا تو وہ اس پر قائم رہیں۔ اور اسی کا پرچار کریں۔ یا یہ سمجھ لیں کہ لیگی مسلمان ـــــ اور دنیا کے باقی انسان یکسر مختلف چیزیں ہیں۔ اور ان کے مابین کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

جن دنوں باہمی مخاصمت اور منافرت کا بازار خوب گرم تھا ان دنوں یو۔پی کے میرے مسلم دوست کو

پنجاب کے ایک ترقی پسند مسلمان ادیب کا خط آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اب وہ قدرے ترمیم کے ساتھ کپلنگ کے مشہور مقولے کے قائل ہو گئے ہیں یعنی ''ہندو ہندو ہے اور مسلمان مسلمان — اور ان دونوں میں کبھی میل نہیں ہو سکتا'' خواہ ہم کسی نظریے سے نفرت کا اظہار کرنا مناسب سمجھیں۔ لیکن اس سے اختلاف رکھنے کا ہمیں پورا اختیار ہے۔ ان معاملوں میں ہم جس قدر صاف گوئی سے کام لیں۔ اسی قدر دونوں پارٹیوں کے حق میں بہتر ہوگا۔ چنانچہ اسی بنا پر میں محمد حسن عسکری کی تحریروں کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ ان اختلافات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور اسی بنا پر کرشن چندر کی اسی موضوع پر لکھی ہوئی منتشر کہانیوں سے کوئی بڑا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ گہرے سیاسی سماجی اور تمدنی اختلافات سطحی قسم کی جذباتیت سے حل نہیں ہوا کرتے۔

جو نظام حکومت ہندوستان پیش کر رہا ہے۔ اور جو سماجی معاشی تمدنی اور سیاسی نظریے اس وقت تک رواج پا چکے ہیں۔ وہ بھی خامیوں سے خالی ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے لیکن ان میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے پُر اعتماد اشارے ہیں۔ ان میں ایک نئی دنیا کے وجود میں آنے کی درخشندہ امید جھلک رہی ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے پاکستان والے یک جست صدیوں پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اور یہ ایک طے شدہ امر ہے۔ کہ مذہبی ریاست کے ناخدا یا تو اپنے نظریوں میں ترمیم کریں گے یا ہٹ جائیں گے — یہ پیشگوئی نہیں ہے دھمکی نہیں ہے بدخواہی نہیں ہے۔ بلکہ محض اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ کہ نئی اقدار جنم لے کے رہتی ہیں۔ اور پرانی مٹ کے رہتی ہیں — اہلِ بصیرت کی آنکھیں ہنگامی تبدیلیوں سے خیرہ نہیں ہوا کرتیں۔

ترقی پسند ادیبوں نے پہلے پہل تو وعدہ کیا۔ کیونکہ وہ لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت ایک پلیٹ فارم پر جمع تھے لیکن بہت جلد پاکستان کے ادیبوں میں سے بعض کو ہندوستانی ادیبوں کی نیت میں فتور نظر آنے لگا۔ بہت جلد انہوں نے ''پاکستانی ادب'' کی تبلیغ شروع کر دی۔ اور حکومت پاکستان نے بھی ملک کے ترقی پسند اور مقبول ترین رسائل نقوش، سویرا، ادب لطیف وغیرہ کو مشترکہ بند کر کے بتا دیا۔ کہ آئندہ پاکستان کے ادیبوں کو کیا سوچنا ہے۔ کیا سمجھنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

اسی ترتیب کی روشنی میں اردو ادب کی ترقی پسند تحریک کا یہ ہلکا سا پس منظر ہے۔ جس کا تذکرہ ناگزیر تھا۔

''جب کشمیر جل رہا تھا'' ایک ایسے ادیب کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو ہندوستان کا باشندہ ہے۔ وہ ترقی پسند

ادب کا وہی مفہوم سمجھتا ہے۔ جو قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اور جو مفہوم کچھ مدت پہلے خود پاکستان کے بیشتر ادیب بھی سمجھا کرتے تھے۔

مجھے اس امر کا افسوس ہے۔ کہ اس کتاب کے تعارف میں واگر کی فن نگاری کے سارے محاسن بیان نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ سب کے سب افسانے (اور تمثیلیں) ایک ہی موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اور تقریباً ایک ہی کیفیت کے حامل ہیں۔ لیکن اتنا کہنا بے محل نہیں ہوگا۔ کہ وہ آگے بڑھتے ہوئے نئے افسانہ نگاروں کی صف اول میں شامل ہیں۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ افسانہ نگاری میں ایک خاص باب کا اضافہ کریں گے۔

جو کچھ کشمیر میں لٹیروں کے حملے کے دوران میں پیش آیا۔ وہ انہیں حالات کی ایک کڑی ہے۔ اور اس کے پس پردہ بھی بہت — وہی رجعت پسندانہ اور ظالمانہ جذبہ کارفرما تھا۔ اب رفتہ رفتہ یہ مسئلہ خالص سیاسی صورت اختیار کر رہا ہے۔

واگر سنجیدہ طبیعت نوجوان ہیں۔ عام طور پر ان کی کہانیوں میں انسانی ذہن کی گہری اور گوناگوں کیفیات کا تذکرہ ملتا ہے انہیں علم النفسیات سے خاص شغف ہے۔ اسلئے ان چیزوں کو کمال چابک دستی سے سنبھالتے ہیں۔ جن مسائل پر انہوں نے موجودہ کتاب میں قلم اٹھایا ہے۔ وہ بظاہر ان کے بس کا روگ نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کہانیوں کا ایک عجیب پہلو یہ بھی ہے کہ کس طرح ہنگامی موضوع حقیقی فن کار کے موقلم کی جنبش سے اچھوتی اور لافانی تخلیق بن سکتا ہے

مثال کے طور پر اس مجموعے کا افسانہ ''افق'' ہی لیجئے۔ فسادات کی بابت جتنے افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے بہت کم اس کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے خاندان کی کہانی ہے سیدھے سادے انداز میں کہانی کی تمہید و انتخاب قابل تعریف ہے۔ اور بالآخر انتہائی نقطہ تک پہنچا۔ جب میاں بیوی انسان کی بہیمی فطرت وہ پاگل پن کا شکار ہو کر ہسپتال میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر بجائے خود بہت دردناک ہے۔ میاں بیوی کی موت نظریں آخری مرتبہ ملتی ہیں ''..... اور پھر ان کی نگاہوں میں صرف موت کی خاموشی، تھکن، ویرانی اور سکون باقی تھے۔ اور چار پھٹی پھٹی آنکھیں، ایک دوسرے پر جمی تھیں'' — مایوس، لڑکھڑاتی، روتی بسورتی ہوئی انسانی زندگی کا اس سے بہتر منظر پیش نہیں کیا جا سکتا...... ''والدین کی موت کے بعد یتیم بچہ اپنے والدین کو ڈھونڈ رہا تھا جنہوں نے ہی کی زندگی سے اچانک اپنا خنک سایہ چھین کر اسے یتیمی کے تپتے ہوئے صحرا میں پھینک دیا تھا۔ اور اس کی معصوم شفاف چمکتی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں ایک افق لرز رہا تھا۔ ایک ایسا افق جو خون کے داغوں خنجر کی دھاروں اور آگ کے شعلوں سے روشن تھا۔۔۔''

کوئی بتائے۔ کہ آخر وہ کونسا مذہب تھا۔ وہ کونسا انسانی اصول تھا۔ ایسا کونسا پاکیزہ سیاسی نظریہ تھا جس کے

تھا۔ ایک معصوم روح کو تنہائی کا اس قدر شدید احساس ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس شخصی دور کے انسان کے ذہن کی کم ظرفی اور اس کے دل کی بے بضاعتی اور مجبوری کو بیان کرنے میں ذاکر کو خاص ملکہ حاصل ہے۔

جہاں اوقت فن کار کی سادگی اور پرکاری کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ اور جہاں گہری نقطۂ نظر اور شدتِ تاثیر کے لحاظ سے یہ کہانی ممتاز ہے۔ "ہاں جنم سے جیت تک" ایک ایسا حسین و جمیل مرقع ہے جس میں درد، ذکسک اور نشاط و مسرت عجب فن کارانہ دلربائی کے ساتھ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ جبل امید و مایوسی اور امید کے دلکش امتزاج سے یہ فن پارہ باقی افسانوں کے بغیر بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کشمیر کی وادی گیاہ و گل میں چلتے پھرتے معصوم انسانوں کی ضروریاتِ زندگی کی دوڑ میں ان کی تمنا دو ان کے بجھے بجھے دل، ان کے خیالی رنگ محل اور پھر مذہبی جنون و عقائد کے دریا میں ڈوب کر رفتہ رفتہ ابھرتے ہوئے انسانوں کے اس کارواں کا جائزہ لینے میں ذاکر نے حیرت انگیز ذکاوت، حس اور فسوں کاری کا ثبوت دیا ہے۔

"ملاوہ" گویا ایک حساس دل کی درد انگیز چیخ ہے۔ جو کشمیر کی گود میں پلا ہوا ایک جوان جس نے مادرِ وطن سے بڑی شدت کی محبت کی ہے جس نے اس خطۂ زمین کی کھیتیوں میں کسان کے گاڑھے پسینے کو جذب ہوتے ہوئے دیکھا ہے جس نے اس حسین اور پُربہار وادی میں بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں اور ضرورت و احتیاج کے ہاتھوں مجبور انسانوں کے دکھتے ہوئے دلوں کا جائزہ لیا ہے۔ اور جس نے سرمایہ داروں اور مذہب کے اجارہ داروں کی ریشہ دوانیوں کے باعث لاکھوں انسانوں کو نڈھال اور بےچارہ ہو کر ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے۔

"آج کی رات" تاریخِ ہندوستان کے اس تاریک ترین اور عجیب دور کا ایک ورق ہے جسے مشکل ہی سے بھلایا جا سکتا ہے۔ اپنی دھرتی ماتا کی خاطر جان کی بازی لگا دینے والا ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو ایک تاریک رات کی کیفیت لکھتا ہے۔ ایک دوسرے سے کالے کوسوں دور دو دل کس طرح محبت اور جذبات سے بھری ہوئی فضا میں بھی ایک ہی تال پر دھڑکتے ہیں۔ "یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی شاید اب کبھی زمین تک پہنچے گی ہی نہیں۔" اور پھر "آج کی رات ہمارے ملک کے لئے کتنی اہم رات ہے۔ اس رات کے اندھیرے میں ہمارا مستقبل سانس لے رہا ہے۔" ——— کیا پہلے کبھی محبت کے متوالوں کو اس قسم کے حادثات پیش آئے تھے؟ ——— خیر یں فرہاد، لیلےٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں ——— مگر کسی نے بھی ایسی گھٹی گھٹی فضا میں اکھڑے اکھڑے سانس لئے تھے۔ اور پھر افسانے کے اختتام پر یاس و حسرت کی بے پناہ تاریکی میں موہوم امید کی ٹمٹماتی ہوئی لو ——— "آنے والی برسات جو

شاید پُر سکون ہو اور جس میں تمہیں کسی ایسے زخمی کے سرہانے نہ بیٹھنا پڑے۔ جو تمہیں میرے متعلق سوچنے پر اکسائے۔"

تمثیلچے اگرچہ خوب ہیں لیکن برجستہ مکالموں کے بغیر یہ چیزیں پھبتی نہیں۔ اس کیلئے کتابی زبان کا جاننا کافی نہیں ہے بلکہ روزمرہ پر عبور لازمی ہے۔ افسانوں کے مقابلے میں تمثیلچے قدرے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر ذاکر کا نقطۂ نظر وہی ہے۔ جو ہندو یونین کے ایک ترقی پسند ادیب کا ہو سکتا ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے لیکن جو تاثر پیش کئے گئے ہیں۔ وہ کسی خاص مذہب، فرقے یا جماعت کیلئے مخصوص نہیں ہیں۔ ان فسادات میں مظلوم نہ مسلمان تھے نہ ہندو اور نہ سکھ۔ اگر کوئی مظلوم تھا۔ تو وہ تھی انسانیت۔

ذاکر نے ہمیں ایک مرتبہ پھر دعوتِ عمل دی ہے۔ آج پھر ہم اپنے عہد کو تازہ کر سکتے ہیں۔ کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی نیکی یہ سمجھتے ہیں۔ کہ دنیا کے ہر فرد کو پیٹ بھرنے کے لئے اناج، تن ڈھانپنے کو کپڑا، اور دھوپ و بارش سے بچنے کے لئے اس کے سر پر آسمان کے علاوہ کوئی چھت بھی مہیا ہونی چاہیئے۔ ہم یک زبان اعلان کرتے ہیں۔ کہ دنیا کا کوئی بلند ترین مذہب، ارفع ترین سیاسی اصول، پاکیزہ ترین سیاسی نظریہ اس قابل نہیں ہے۔ کہ اس کی خاطر زندہ بچوں کو دروازوں کے ساتھ میخوں سے جڑ دیا جائے۔ یا معصوم دوشیزاؤں کی نوخیز چھاتیوں کو کاٹ کر قہقہے لگائے جائیں۔ مردوں کے سامنے ان کی پردہ نشین عفت مآب عورتوں کی عصمت دری کی جائے۔ ہری بھری لہلہاتی کھیتیوں کو پھونک کر تالیاں بجائی جائیں۔ اگر ایسا کوئی اصول، کوئی مذہب، کوئی نظریہ معرضِ وجود میں آچکا ہے۔ تو ہم اس سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس پر نفرین بھیجتے ہیں۔

بلونت سنگھ

دہلی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء

آج کی رات

تیرگی کے اس گہرے پردے پر تمھاری تحریر کی چند سنہری لکیریں جانے کیسے تھرک گئیں؟

ہفتہ بھر سے ڈاک بند تھی اور ڈاک کا خیال آتا بھی کسے تھا۔ جب انسان کی زندگی ہی غیر محفوظ ہو جاتے۔ جب اُسے وقت کا ہر لمحہ موت کا رُوپ دھارے اپنے نزدیک سرکتا معلوم ہوتا ہو تو اُس کا ذہن سوائے حفاظتی تدبیریں سوچنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا، موت کے خوف سے لرزتا ہوا انسان شاید دنیا کی ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے۔ کیا تم نے ایسے واقعات سنے یا پڑھے نہیں (دیکھے تو نہیں ہوں گے اور خدا سے دعا کرو وہ ہمیں ایسے واقعات دیکھنے کا موقع نہ ہی دے) جب لوگوں نے اپنے عزیزوں کو اپنے سامنے مرتے دیکھتے۔ اور کٹتے دیکھا اور انھیں بچانے کی جرأت نہ کی فقط بھاگنے ہی کی کوشش کی کتنا آسان ہے بھاگنا اور کتنا مشکل بھی۔ بعض دفعہ ہمارا بھاگنا اپنی جگہ پر ڈٹے رہنے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے —— کیوں کیا خیال ہے تمھارا؟ میں نے بھی تو جذبات کی چوٹوں سے بچنے کے لئے بھاگنے کی کوشش کی

کوشش ہی نہیں کی بلکہ بھاگا بھی تھا۔ تو کیا میں کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ سکا تمھارا خیال ہوگا میں حملے کی زد سے بچ کر آرام اور سکون سے کہیں بیٹھا گیتوں کی نئی دُھنیں نکال رہا ہوں گا۔ مگر نہیں میری صحیح پناہ گاہ وہی تھی جسے میں نے چھوڑ دیا تھا کسی اور خندق میں خود کو چھپانے کے لئے اس پناہ گاہ سے نکل کر میں ہمیشہ بموں اور گولیوں کی ہی زد میں رہا۔ اور اب میرا انگ انگ۔ چُور ہو چکا ہے۔ اب گیتوں کی دُھنیں تو ایک طرف خود گیت بھی میرے ذہن کی تہوں میں نشتر بن کر چبھتے ہیں۔

موت کے خوف سے لرزتا ہوا انسان شاید دنیا کی ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے۔ محبت کے زخموں سے بھی، شکست کے سے بھی، فرقت کے داغوں سے بھی اور کتنے جان لیوا ہوتے محبت کے زخم، شکست کے ناسور اور فرقت کے داغ مگر موت کا خیال جب دل و دماغ پر چھا جاتا ہے تو زخم دکھنا بند کر دیتے ہیں ناسور بہنا چھوڑ دیتے ہیں اور داغوں کی تپش ماند پڑ جاتی ہے۔ مجھے اس ایک ماہ کے عرصہ میں کبھی تمھارا خیال نہ آیا۔ تم میری اس تلخ بات کو نہ مانو گی۔ مگر خدارا برا نہ ماننا۔ جب تین برس کے بعد تم نے میری خیریت کے متعلق پوچھا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوا ہے۔ جیسے تم نے موت کے تیروں کا مقابلہ کرنے کے لئے مجھے ایک فولادی ڈھال دے دی ہے۔ اب کچھ عرصہ میں موت کا ہمت سے مقابلہ کر سکوں گا —— میں حیران ہوں کہ جب تم مجھ سے زیادہ غیر محفوظ ماحول میں رہی ہو تمھاری زندگی کو میری زندگی سے زیادہ خطرہ ہے۔ تمھارے بچاؤ کے ذرائع مجھ سے کم ہیں۔ تو تمہیں میری زندگی کا خیال کیسے آگیا۔ مجھے تو ان پچھلے دنوں

میں سوائے اپنے کسی کا خیال نہیں آیا ۔ آج سات دن کے بعد ہرزن سے کا ایک پلندہ دینے آیا تو میں اُس کے چہرے کو زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ اس کے چہرے پر خوف نے اپنا تسلط جما رکھا تھا ۔ اُس کی آنکھوں میں مجبوری جھلکتی تھی ۔ اس کی چال میں لرزش اور گفتگو میں لڑکھڑاہٹ تھی ۔ میں نے اُس کے خط دینے کے فوراً بعد ہی ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لیا ۔ آج سات دن کے بعد ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا تھا ۔ میں کھڑکی میں کھڑا اس غریب پوسٹ مین کو دیکھنے لگا ۔ وہ گلی میں سے گزرتے ہوئے وہاں کی ہر چیز سے خوف کھا رہا تھا ۔ جیسے مکانوں کی دیواروں میں لگی ہوئی اینٹیں آپ سے آپ اِس پر گر کر اسے کچل دیں گی ، جیسے بند کھڑکیوں کے پیچھے سے کوئی اس پر تیزاب کی بوتل انڈیل دے گا ۔ جیسے ابھی کوئی پیچھے سے آکر اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دے گا ۔ اور پیشتر اس کے کہ ہونٹوں سے چیخ نکلے وہ نظر سے اوجھل ہو جائے گا ۔ کتنی ہی دیر میں اسے دیکھتا رہا اور جب وہ گلی کے نکڑ پر نظروں سے غائب ہو گیا ۔ تو میری توجہ ہاتھ میں پکڑے خطوں کی طرف پڑی ۔ میں اندر آکر بیٹھ گیا ۔ اور انھیں پڑھنے لگا ۔ میری نظر لفظوں کو پڑھ نہیں رہی تھی سطروں کو پھلانگ رہی تھی ۔ بظاہر میں خط پڑھ رہا تھا ۔ لیکن خط ختم کر چکنے کے بعد کوئی بھی بات میرے دماغ میں محفوظ نہ ہوتی تھی — اور اسی طرح خطوں کو کھولتے اور پڑھتے ہوئے تمھارا خط میری نظر سے گزرا میری انگلیاں لرزنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے تیز سا خنجر میرے دل میں گھونپ دیا تھا ۔ میرا دل کراہ اٹھا ۔

کوشش تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں جلد از جلد اپنی خیریت کی اطلاع دوں ۔ تم نے لکھا ہے کہ تم کئی دنوں سے اسپتال کی چاردیواری کے اندر قید ہو اور زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہی ہو ۔ کون تھا ابھاگا زخمی جو اتنے گہرے زخم کھانے کے بعد بھی نہ مرا ۔ وہ جسے دیکھ کر تمہیں میری یاد آئی ۔ اس کی شکل وصورت اور ذہنی ساخت بالکل میرے جیسی تھی ۔ اسے دیکھ کر تمھیں شک گزرا کہ شاید میں مرنے سے پہلے تمھارے نازک ہاتھوں کے لمس کے لئے اسپتال میں آیا تھا ۔ تم چند لمحوں کے لئے کچھ بھی نہ سوچ سکیں ۔ اور پھر جب تمھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو تم نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور اسی لمحہ میری طرف ایک خط پوسٹ کر دیا ۔ کتنا اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا ۔ میں موت کا سہارا لے کر تم تک پہنچ سکتا تھا ۔ اس بات کی مجھے خبر نہ تھی ۔ میں اسپتال کی مسموم فضا میں آہنی چارپائی پر سانس لیتے ہوئے تمھارے روشن چہرے کی جھلک دیکھ سکتا تھا اور یہ جھلک شاید موت کی اندھیاری میں مجھے اپنی منزل سے نہ بھٹکنے میں مدد دیتی ۔ اسپتال کا خیال آتے ہی کچھ ہفتے پہلے اخبار میں چھپی ہوئی ایک خبر یاد آگئی ہے ۔ بلوائیوں نے اسپتال کے اندر داخل ہو کر دوسرے فرقے کے سب مریضوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا ۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے ۔ سوچتا ہوں ہمارے ملک کے لوگ کتنے ذلیل ہو چکے ہیں ۔ کیا یہ گراوٹ کی انتہا نہیں کہ زندگی اور موت کی درمیانی مخلوط حدوں پر بیٹھے تھکے ہارے اپاہج انسان بھی مذہبی جنون کے تباہ کن اثر سے نہ بچ سکیں ۔ درد اور بیماری سے سسکتے ہوئے انسانوں

کو انہی کے چند بھائی اذیتیں دے کر مار ڈالیں ـــــــ اور تم بھی کتنے دنوں سے اسپتال کی چاردیواری میں قید ہو اور اسپتال کی دیواروں کے باہر بہیمیت کا ایک بپھرا ہوا طوفان تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور اگر کبھی وہ ہسپتال کی دیواروں سے بھی ٹکرا گیا تو ؟

اس وقت شہر میں قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ سیاہ رات ہے، بجلیاں گل ہیں اور اونچے اونچے مکان اندھیرے میں یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے بڑے بڑے بھوت اکٹھے ہو کر انسانوں کو گھیر رہے ہوں۔ گرمی بلا کی پڑ رہی ہے۔ مکانوں کی چھتوں پر لوگوں نے اینٹوں کے انبار لگا رکھے ہیں حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح سبھی لوگ اپنی اپنی چھتوں پر جاگ کر رات گذار رہے ہوں گے۔ قرنوں سے قریب بسنے والے لوگ ایک دم اس طرح اجنبی بن جائیں گے کسے خیال تھا۔ اب اگر کوئی آدمی اجنبیت اور دشمنی کے اس دور میں کسی کی مدد کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔ اس کے اپنے بھائی بند ہی اس کے خلاف ہو جائیں گے اور جب تک وہ اپنے ہمسایہ کو جسے بچانے کی اس نے قسم اٹھا رکھی تھی دشمنوں کے ہاتھ میں نہیں دیدیتا اس کی اپنی جان پر بنی رہتی ہے ـــــــ میں آج بھی جاگ رہا ہوں، ہر رات اسی طرح جاگا کرتا ہوں۔ آج سے تین سال پہلے کے رت جگوں اور اب کی بیداری میں کتنا فرق ہے جب رات کو جاگ کر میں گیت لکھتا، اور ستار پر ان کی دھنیں نکالتا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں میں تمھارے سپنے تھے اور میں جاگ جاگ کر انھیں حقیقت میں بدلتا رہتا تھا۔ اور اب اس لئے جاگتا رہتا ہوں کہ کوئی میرے مکان کو آگ نہ لگا دے۔ مکان میرا نہیں۔ میں تو محض ایک کرایہ دار کی حیثیت سے ہوں۔ لیکن پھر بھی

نیند نہیں آتی۔ مکان سے زیادہ شاید مجھے اپنی زندگی کا خوف ہے۔ آگ کے تند شعلوں میں زندہ انسانوں کو جھلس دینا شاید قرون وسطیٰ کی باتیں تھیں۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہیمیت اور جہالت کا وہ دور ایک بار پھر پلٹ آیا ہے جیسے ارتقا نے ایک الٹا چکر لگایا ہے۔ جیسے انسانی تواریخ نے اپنی روایات کو پھر دہرایا ہے تاکہ چاند ستاروں تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف انسان اپنی اصلیت کو نہ بھولے اُسے یاد رہے کہ افریقہ کے گھنے بنوں میں بسنے والی جنگلی مخلوق ہی اس کی اصلی جنم داتا ہے ـــــــ تم بھی رات بھر جاگتی رہتی ہو گی، اس انسان کے زخموں پر سکون کا پھاہا رکھنے کے لئے جس کی سرشت میں ظالم اور مظلوم دونوں کی خصوصیات بھری پڑی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ چند دنوں سے دن اور رات کا فرق مٹ گیا ہے۔ رات اور دن میں کوئی تمیز ہی نہیں رہی، وہ کام جو رات کے اندھیرے میں بھی چھپ کر کئے جاتے تھے اب دن کے اجالے میں کئے جاتے ہیں اور کرنے والے خود کو مجاہد اور جاتی کے سیوک سمجھتے ہیں اور اپنی کرتوتوں پر فخر کرتے ہیں۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی شاید اب زمین تک پہنچ ہی نہیں رہی۔ اسے ایک گھنے پردے نے ڈھانپ لیا ہے۔ اور اب صرف رات ہی رات ہے۔ بھیانک، کالی۔ گہری رات جس میں موت کے فرشتے رقص کر رہے ہیں کل کائنات جاگ رہی ہے۔ ساری کائنات کی نگاہیں پورب کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ جہاں سے کبھی سورج طلوع ہو کر ذرہ ذرہ کو چمکایا کرتا تھا ـــــــ دھرتی گویا دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ اس کی چیخیں اور کراہیں دور دور تک ہی جاری ہیں۔ کتنا دردناک منظر ہے۔ بوڑھی دھرتی شاید آخری بار کوشش کر رہی ہے، ـــــــ نئے جان کو جنم دینے کی

طاقت اس میں نہیں۔ اب اس کا انگ انگ تھکن سے چور ہو چکا ہے ـــــ اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچہ جس کے جنم کا ہر ذی روح انتظار کر رہا ہے شاید قبل از وقت اپنی ماں کی کوکھ سے باہر آ رہا ہے۔ شاید اسی لئے اس کی نحیف و نزار بوڑھی ماں درد سے کراہ رہی ہے، اس نے اس سے پہلے بھی تو بچوں کو جنم دیا ہے۔ انقلاب فرانس، صنعتی انقلاب۔ انقلاب روس ـــــ مگر اب جیسی تکلیف اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔ اپنی میعاد سے پہلے پیدا ہونے والے بچے کو جنم دینے کے بعد شاید وہ خود بھی زندہ نہ رہ سکے۔ اور اس کا بچہ بھی شاید چند گھڑیوں سے زیادہ جینے کی تہمت گوارا نہ کرے ـــــ اس کی زندگی مجھے ڈر کا ہے اس کے لئے ایک تہمت ہی نہ ہو،

تم نے میری خیریت کے متعلق پوچھا تھا اور میں تمہیں کیا بتا رہا ہوں۔ میرے مکان کی چھت سے تھوڑی ہی دور کسی مکان سے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ ایک شور مچ گیا ہے۔ کسی منچلے نے پٹرول چھڑک کر آگ لگائی اور چلتا بنا۔ شہر میں کرفیو نافذ ہے، اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ہر روز پکڑا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی آگ لگانے اور چھرا گھونپنے کی وارداتیں ہر روز ہوتی ہیں ـــــ کل رات آگ کی کوئی نئی واردات نہیں ہوئی تھی۔ چاندنی رات میں تین چار دن پہلے کی لگی ہوئی آگ ہی سلگ رہی تھی۔ دھوئیں کے گھنے بادل آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔ جیسے عنقریب جنم لینے والے بچے کو نظر بد سے بچانے کے لئے ایک بڑا بھاری ہون کنڈ جل رہا ہو۔ رات میں دیر تک دھوئیں کے انھیں بادلوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان کے [illegible] میں انسانیت اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی ہے۔ اپنا سینہ پیٹ رہی ہے ـــــ اور کسی کی آنکھ [illegible]

پیچھے رونما ہونے والے بھیانک سانحہ کو نہیں دیکھ سکتی، جانے ابھی کتنی راتیں اور آگ سلگتی رہے گی، دھوئیں کے بادل فضا میں تیرتے رہیں گے اور انسانیت اپنی بے بسی پر روتی رہے گی۔

آج کی رات کتنی آہستہ رینگ رہی ہے، ایک ایک لمحہ ایک ایک سال بن کر گزر رہا ہے۔ انتظار کی راتیں کتنی صبر آزما اور طویل ہوتی ہیں۔ سب کو انتظار ہے آنے والی صبح کا۔ اور کون جانے آنے والی صبح آئے گی بھی یا نہیں۔ اور اگر آئے گی تو اپنے ساتھ کیا لائے گی۔ فتح اور خوشی کے ترانے یا سوگ اور شکست کے ماتمی گیت، کتنا متذبذب اور غیر یقینی ماحول ہے۔ اور اس ماحول کے منگاروں پر کھڑے ہو کر بھی دور چھپے ہوئے سلسلہ ہائے کوہ کے پیچھے ظلمت اور نور کی کشمکش کا اندازہ کر رہے ہیں۔ جانے جیت کس کی ہوگی؟ آنے والی صبح ایک غیر مختتم اور چوندھیا دینے والے نور کی حامل ہو گی یا ایک ابدی ظلمت کی۔ ایک ایسی ظلمت کی جس کے پردوں کو چیرنے کے لئے انسانیت ایک بار پھر تڑپے گی اور اپنی چیخوں اور کراہوں سے اس کے دبیز پردوں میں چاک پیدا کرنے کی کوشش کرے گی ـــــ آہ! کتنی طویل اور تلخ رات ہے یہ۔ ستارے ہمیشہ افق کی طرف تکتے رہتے ہیں اور جوں جوں رات گذرتی جاتی ہے ان کے دل خوف اور ناامیدی کے مجموعی تاثر سے ڈوبنے لگتے ہیں۔ انھیں رات سے لگاؤ ہے۔ اندھیرا ان کی زندگی ہے، انھیں ظلمت سے پیار ہے۔ مگر آج تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ چمک چمک کر تھک گئے ہیں۔ جیسے افق کی حدوں کو تک تک کر ان کی آنکھیں دکھنے لگی ہیں۔ اب وہ سونا چاہتے ہیں مسلسل بیداری نے ان کی آنکھوں میں درد کی کھٹک پیدا کر دی ہے۔ اب انھیں پورب سے جھانکنے والی

روشنی سے خوف نہیں آتا۔ اب تو وہ اسے اپنی زندگی کا سہارا سمجھنے لگے ہیں، ان کی چمک ماند پڑنے لگی ہے وہ لڑکھڑانے لگے ہیں، وہ دیکھو ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا تارہ ٹوٹ کر ابدی نیند حاصل کرنے کے لئے پستی کی گہرائیوں کی طرف لڑھک رہا ہے۔ جانے پورب کے دیوتا کو ان سسکنے لرزنے اور ٹوٹنے والے تاروں کے جذبات کا خیال ہے بھی کہ نہیں!

آج کی رات ہمارے ملک کے لئے کتنی اہم رات ہے۔ اس رات کے اندھیرے میں ہمارا مستقبل سانس لے رہا ہے۔ اس میں چالیس کروڑ انسانوں کی زندگیوں کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وائسرائے لندن میں جاکر ہندوستانیوں کے لئے ایک اور کھلونا لے آیا ہے۔ سب لوگوں کو امید ہے کہ یہ کھلونا خوبصورت اور مضبوط ہوگا —— لیکن میں جانے کیوں الٹا سوچ رہا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ کھلونے جتنے زیادہ خوبصورت ہوں گے اتنے ہی جلد ٹوٹ جائیں گے۔ کھلونا اور مضبوطی تو ایک تضاد ہے اور یورپ تم جانتی ہو کھلونے بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ تم نے دکانوں میں لٹکے اور الماریوں میں سجے ہوئے خوبصورت کھلونے تو دیکھے ہی ہوں گے اور کئی ایسے کھلونے بھی ہیں جو ذرا سی کوک بھرنے سے طرح طرح کے کرتب کرتے ہیں —— میں سمجھتا ہوں ہندوستان کا ہر لیڈر ایک کھلونا ہے کوئی تھوڑی سی کوک سے پھدکنے اور ناچنے لگتا ہے اور کسی کو ذرا زیادہ کوک کی ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت غیر ساکن فضا میں لٹکے ہوئے کھلونے عجیب عجیب حرکتیں کر رہے ہیں اور جو لیڈر مداری کے اشاروں پر نہیں ناچتا جان لو کہ اس کی مشین میں ضرور کوئی نقص ہے یا اس کا ضرور کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔

اور اس رات کا اختتام ہمارے لئے ایک نئے پیغام کا حامل ہے ایک

ایسا پیغام جس کو سننے کے لئے لوگوں کے کان بے تاب ہیں، جس میں دو قوموں کی زندگیوں کی راہیں تعین کرنے کے اشارے ہوں گے —— اور یہ رات عالیشان مکانوں کو نگلتے ہوئے شعلوں سے روشن ہے، اس میں دھوئیں کے سیاہ مہیب بادل ستاروں کو ڈھانپنے کی کوشش میں مصروف ہیں، اس میں زخمی لوگوں کی کراہیں دم توڑ رہی ہیں، اس میں نوجوان عورتوں کے سہاگ لٹ رہے ہیں، اس میں انسانیت مجموعی طور پر اپنا ماتم آپ کر رہی ہے —— اس رات میں تلخ بیداری ہے۔ ساری کائنات کی نگاہیں دھوئیں میں کھوتے ہوئے مشرق کو ٹٹول رہی ہیں —— اور یہ رات جانے کب ختم ہوگی، جانے اس بھیانک، کالی، گہری رات کی صبح کب ہوگی؟

اگر اس شب تیرہ و تار کی سحر کبھی ہوئی، اگر کبھی پورب کے افق میں چھائے ہوئے گھنے بادل پھٹے، اگر ستاروں کی شب بیداری اکارت نہ گئی —— تو شاید یہ خط تم تک پہونچ سکے اور تم جان سکو کہ میں ابھی زندہ ہوں اور مجھے بھی آنے والی پربھات کا انتظار ہے، آنے والی پربھات جو شاید پرسکون ہو اور جس میں تمہیں کسی ایسے زخمی کے سرہانے نہ بیٹھنا پڑے جو تمہیں میرے متعلق سوچنے پر اکسائے

—— ❊ ——

اُفق

کتنا دکھ ہوا تھا اُسے جب اُس کا خاوند کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ اُن کا محلہ دھڑا دھڑا خالی ہو رہا تھا۔ فساد کی آگ پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ پانی کے ٹھنڈے چھینٹے جو اس پر پھینکے جا رہے تھے اُسے بجھانے کی بجائے اور زیادہ بھڑکا رہے تھے۔ چھینٹوں سے تو صرف چند انگارے بجھ سکتے ہیں جو اپنے گرد راکھ کی تہ لپیٹ کر ہر لمحہ اپنی چمک کھوتے جائیں، جہنمی آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کے لئے تو کسی آبشار کی ضرورت ہے، چھینٹوں سے کام نہیں چلتا اور آگ کی لپٹیں اپنی بھیانک خون آلود زبانیں فضا میں لہراتی ہوئی امن کے کھلیان ——————— کو نگل رہی تھیں۔

اب انھیں اپنا گھر چھوڑنا ہی ہوگا —— ان کا گھر، ایک پناہ گاہ جسے وہ مدت کی دوڑ دھوپ کے بعد حاصل کر سکے تھے، ٹوٹی ہوئی دیواروں اور شکستہ دروازوں کا مختصر سا مجموعہ جو گرمیوں میں دھوپ کی تپش اور برسات میں بارش کی نمی سے تو ضرور بچا سکتا تھا حادثات کے حملوں سے نہیں۔ یوں تو انھوں نے کئی بار سوچا تھا اپنی اِس

پناہ گاہ کو بدلنے کے متعلق لیکن اقتصادی لحاظ سے وہ کبھی اس قابل نہ ہوئے ایک دن انھیں اس سے بھی محروم کر دیا جائے گا یہ بات اُن کے ذہن میں کبھی نہ اُبھری تھی۔ یہاں انھوں نے اپنی متاہل زندگی کے چند سال گذارے تھے۔ اس کی اینٹ اینٹ سے انھیں پیار تھا، ہر شے پر اُن کی محبت کے نقوش تھے۔ صحن کے اونچے نیچے گڑھوں میں ان ناسوروں کی یادیں تھیں جو انھیں زندگی کی جدوجہد میں بطور انعام ملے تھے۔ ان یادوں سے ان کا ماضی زندہ تھا۔ وہ ماضی کے ان دُھندلے چراغوں کی مدد سے مستقبل کی راہیں ٹٹولتے تھے اور اب ایک زبردست طوفان ہر ایک اینٹ سے ٹکرانے والا، ہر نقش کو مٹانے والا اور ہر گڑھے کو گدلے پانی سے بھر دینے والا تھا چراغ کو وقت سے پہلے بجھا دینے والا تھا وہ طوفان —— ! رام ناتھ کے چلے جانے کے بعد شیلا دیر تک خلا میں گھورتی رہی، ایک خلا جس میں نجی زندگی کی یادیں اور بدلتے ہوئے ماحول کے خاکے تیر رہے تھے۔ اپنے مکان کی چھت پر کھڑی شیلا محلّے کے مکانوں کو دیکھ رہی تھی جن میں سے بیشتر مکان خالی پڑے تھے، جن میں رہنے والے لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے جانے کہاں کہاں بھٹک رہے تھے۔ اونچے اونچے عالیشان مکان اُسے مقبرے معلوم ہو رہے تھے جن میں لگی ہوئی اینٹیں اپنے بوجھ سے نیچے پڑے مردہ اجسام کو کچل رہی تھیں، ہڈیوں کو پیس رہی تھیں اور تعفن کی لپٹوں کو باہر نکلنے سے روک رہی تھیں۔ وہ دیر تک اِن مقبروں کو دیکھتی رہی۔ وہ مکان کبھی آباد ہوں گے، ان میں کبھی مترنم قہقہوں کے نغمے گونجیں گے، اب کبھی ان میں خوشی اور مسرت کے گیت گائے جائیں گے کون جانتا تھا؟ لیکن اس وقت تو یہ مقبرے

ہی تھے، مردوں کی یادگاریں، ماضی کے دھندلے نشان، زندگی کے ٹوٹے ہوئے سپنے —— اور فضا میں دور لہراتے ہوئے دھوئیں کے بادل شیلا کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ شہر کے کسی حصّہ میں آگ لگی تھی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی حصّہ برباد کیا جا رہا تھا، ہر رات مرتے ہوئے زخمی انسانوں کی کراہوں سے گونج کر صبح کے دھندلکے میں کھو جاتی تھی، ایسا دھندلکا جس میں خون کی سُرخی آگ کی تپش، اور دھوئیں کے بادل تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ عمارتوں کے جلنے سے پھیلا ہوا کڑوا کسیلا دھواں اُسکی آنکھوں میں گھس کر ایک ناقابل برداشت چبھن پیدا کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی دُکھتی ہوئی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا اور سوچنے لگی کہ آگ اگر خوبصورت قیمتی اور عزیز چیزوں کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے تو دنیا کی بدصورت، گھٹیا، گلی سڑی اور نفرت آمیز چیزوں کو بھی تو جلاتی ہوگی۔ اگر وہ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے اونچے اونچے مکانوں کو راکھ کر سکتی ہے تو ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے بھی جن میں گندگی اور کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں تند شعلوں کی زد میں آنے چاہئیں —— اور اسے جانے کیسے محسوس ہوا کہ تاروں کو چھونے والے اونچے منارے تو جل جاتے ہیں لیکن کوڑی پر لگے ہوئے ڈھیر اسی طرح محفوظ رہ کر ماحول کو متعفن اور گندہ کرتے رہتے ہیں۔ زندگی سے سندر، شگفتہ، روشن اور رنگین چیزیں تو چھن جاتی ہیں لیکن بے مصرف، بھونڈی اور تاریک چیزوں کو کوئی نہیں چھینتا۔ جیون کے سپنے لوٹ لئے جاتے ہیں ان کے ٹوٹنے کی گونج نہیں، امیدوں کو مٹا دیا جاتا ہے ان کے خون کے دھبوں کو نہیں، حسرتوں کو ختم کر دیا جاتا ہے ان کے دم گھونٹنے والے دھوئیں کو نہیں۔ امارت اور زرپرستی

کو مٹانے کے ذرائع تو سوچے جاتے ہیں لیکن غربت اور جہالت کو سنوارنے کے نہیں —— اور ایک بھیانک دھماکے کی آواز سے وہ چونک پڑی کہیں کوئی بم پھٹا تھا۔ یہ دوسرا بم تھا۔ پہلا بم کل شام پھٹا تھا جب رام ناتھ کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے مکان کی ٹوٹی ہوئی دیواریں اور شکستہ دروازے جھٹکے کی شدت سے لرز رہے تھے —— شیلا کی کانپتی ہوئی پلکیں افق کی پہنائیوں کی طرف اٹھیں جہاں رات کے گھنے سائے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہے تھے۔

جب رام ناتھ گھر سے روانہ ہوا تو سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں رات کے لمبے سیاہ گیسوؤں پر اپنے الوداعی طویل بوسے ثبت کر کے پگڈنڈیوں کے موڑوں سے اسے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں اور رات اپنے سیاہ گیسو پھیلائے تاروں کے دیپ جلانے کی کوشش میں مصروف تھی، شاید کرنوں کے بوسوں کو ابد تک روشن اور منوّر رکھنے کے لئے اور جب گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو کتنے ہی بڑے بڑے چنگارے انجن کے دھوئیں کے ساتھ نکل کر چند لمحے فضا میں رچی تیرگی میں ناچے اور رات کے گیسوؤں میں آ الجھے تھے۔ گاڑی کھچا کھچ بھری تھی۔ لوگ اپنا سامان اور اپنے عزیزوں کی زندگیاں لئے بھاگ رہے تھے، انسانی زندگیاں جو دھوئیں میں بھڑکتے ہوئے روشن چنگاروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس کی گہری چھاپ تھی اور ان کی گفتگو بھی مصیبتوں کی ایک داستان اور وہ داستان طویل ہوتی جا رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا ہر مسافر داستان کی ایک ایک کڑی جوڑ رہا تھا۔ جانے اس کی تکمیل کہاں تھی —— رام ناتھ کچھ عرصہ اس نئے ماحول

سے متاثر ہوتا رہا اور اس کے بعد اس کے ذہن میں اپنی گھریلو زندگی کی یاد چبھن پیدا کرنے لگی۔ محلے میں اس کا گھر شاید سب سے چھوٹا تھا لیکن اُس میں اطمینان کتنا تھا۔ اس کی گرہستی کتنی کامیاب تھی! اور پھر اس کی توجہ اپنے پانچ سالہ بچے کی طرف مڑ گئی۔ اس کے پہلے دو بچے مر گئے تھے۔ یہ تیسرا بچہ تھا۔ اس کے مستقبل کا چراغ، اس کی زندگی کی تابندہ امید، اس کے سپنوں کی مٹھاس اور اب اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کئی خون آلود ہاتھ اس کے بچے کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ اور اس کی بیوی بچے کے آگے کھڑے ہو کر اُسے بچانا چاہتے تھے۔ یہ روٹی کی زندگی کے لئے ہی تھا کہ آج رام ناتھ پردیس میں اپنے لئے کوئی خندق ڈھونڈنے جا رہا تھا۔ جس میں وہ اپنے بچے کو چھپا کر خود گولیوں کا سامنا کریں۔

اُس نے دفتر سے چار روز کی رخصت لی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ایک دوست تھا۔ دونوں اس اجنبی شہر میں کوئی پناہ گاہ حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ موت کے خوف سے بھاگے ہوئے انسان ہزاروں کی تعداد میں وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ بیشتر لوگوں نے اپنے لئے ٹھکانے بھی ڈھونڈ نکالے تھے لیکن اس میں بھی وہی لوگ کامیاب ہوئے تھے جنہوں نے سر جھکانے کے لئے کسی گڑھے کی زیادہ سے زیادہ قیمت پیش کی تھی۔ غریب لوگوں کو یہاں بھی دھکے ہی ملے تھے گویا ان کی زندگی کا مدار دھکوں اور ٹھوکروں پر تھا، قدرتی اصولوں پر نہیں اور رام ناتھ اور اس کا دوست دونوں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے۔ کسی اچھے کاروبار کے مالک نہیں۔ انھیں بھی اتنے بڑے شہر میں اپنے لئے کوئی آسرا نہ مل سکا اور آخر سرائے کے ایک سوپیل سے اٹے

ہوئے تاریک اور تنگ کمرے کی حفاظت کے لئے اپنے دوست کو چھوڑ کر رام ناتھ واپس روانہ ہو پڑا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سرائے میں رہنے کی ایک معین معیاد ہے اس کے بعد وہ وہاں سے نکال دئے جائیں گے۔ رام ناتھ اپنے دوست کے اور اپنے بیوی بچوں کو لانے جا رہا تھا، انھیں ایک جانے پہچانے ماحول سے نکال کر ایک اجنبی اور گھٹے ہوئے ماحول میں پھینکنے کے لئے۔ گاڑی میں جتنے مسافر تھے تقریباً سبھی اپنے کسی عزیز کو لانے اور واپس اپنی پناہ گاہ میں پہنچنے کی آرزو دل میں لئے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک افسردگی اور جسموں میں ایک تھکن بھری پڑی تھی۔ جیسے وہ ایک طویل سفر سے لوٹ رہے تھے۔ ایک ایسا سفر جس میں انھیں چلنا نہیں بھاگنا پڑا تھا خوف کے خونخوار بھیڑیے کے آگے آگے بھاگ بھاگ کر اُن کے اعضا ٹوٹ رہے تھے، اُن کی سانسوں میں ایک عجیب سا الجھاؤ تھا اور سفر ابھی جاری تھا۔ ایک راستے میں سے کئی اور راستے نکل رہے تھے۔ جانے اس سفر کی منزل کہاں تھی۔ کہیں تھی بھی کہ نہیں؟ گاڑی جا رہی تھی۔ اس میں بیٹھے ہوئے مسافر اگر اپنے لئے کسی منزل کا تعین نہ کر سکیں تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اس کی تو اپنی منزل تھی جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گاڑی کے ڈبے ایک دل شکن ڈھنگ سے خالی ہو رہے تھے شاید ہی کسی اسٹیشن سے کوئی مسافر سوار ہوتا ہو سبھی اسٹیشن ویران تھے اور رونق و آبادی گاڑی کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ واپسی پر گاڑی کے ڈبے پھر کھچا کھچ بھرتے جائیں گے حتیٰ کہ ان میں بیٹھے مسافروں کی پناہ گاہ قریب آ جائے گی اور وہ سب دھاندلی سی مچاتے اس غار میں گرنے کے

لئے جدو جہد کریں گے اور اس میں کھائی ہوئی چوٹوں کو مدتوں تک سہلاتے رہیں گے ـــــ گاڑی کے ڈبے خالی ہو رہے تھے اور رام ناتھ اور اس کے ساتھی مسافر افسردہ اور خوفزدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ اُن کے لب خاموش تھے لیکن دماغ چیخ رہے تھے۔ جانے کیوں ہر آدمی کسی خطرہ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ جانے کیسے انھیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گھر خیریت سے نہ پہونچ سکیں گے۔ جوں جوں اسٹیشن گذرتے جاتے ان کا خوف گھٹتا جاتا۔ اور جب انھوں نے اپنی انفرادی زندگی کی بجائے اپنے گھر والوں کے متعلق سوچنا شروع کیا جنہیں وہ پیچھے چھوڑ گئے تھے تو ان کے ذہن پھر الجھنے لگے ـــــ اور اسٹیشن سے ذرا اس طرف جب اچانک گاڑی رُک گئی تو ان سب کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اُن کی گردنوں کو دبوچ لیا تھا۔ تڑپ کر اُن سب نے ڈبے کی کھڑکیوں سے باہر جھانکا۔ بلوائیوں کا ایک ہجوم گاڑی کے ڈبوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اور جب ایک دیوہیکل آدمی چھرا تانے رام ناتھ کی طرف بڑھا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی تمام زندگی سِمٹ کر خنجر کی نوک پر جم گئی تھی، خون آلود خنجر۔ جانے کتنے انسانوں کی زندگیاں خون کے قطروں کی شکل میں خنجر کی دھار پر تڑپ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم گرم خون کی ایک ابلتی ہوئی ندی رینگنے لگی۔

"میں ہندو ہوں" اس کی نگاہیں خنجر کی نوک اور بلوائی کی خونی

آنکھوں کے درمیان گھوم رہی تھیں۔

"چوٹی کہاں ہے تمھاری؟" قاتل کی آواز میں بجلی کی کڑک اور رام ناتھ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔

"نہیں" اس کی انگلیاں اپنے لمبے لمبے بالوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

"جنیؤ دکھاؤ" آواز ایک بار پھر کڑکی۔

"نہیں ہے" خوف سے تھرتھراتا ہوا ہاتھ سینے تک پہونچ کر رُک گیا۔

"بکتا ہے حرامزادے" اور لمحہ بھر میں خون کی ایک دھار نے چھوٹ کر قاتل کے کپڑوں کو داغدار کر دیا۔

"دھوکا دیتے ہیں سالے" اس نے بغیر کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور دوسرے مسافر کی طرف جھپٹا۔

شیلا نیند سے اچانک چونک پڑی ان کے محلے میں آدھی رات کے وقت ایک شور سا مچ گیا تھا۔ کسی نے قریب کے ایک خالی مکان کو آگ لگا دی تھی۔ آگ کے شعلے لپک کر اِدھر اُدھر پھیل رہے تھے۔ جیسے وہ قریب کی ہر شے کو جھلسنا چاہتے ہوں۔ مکان والے تو پہلے ہی سے اپنی زندگیاں لے کر بھاگ گئے تھے۔ ہمسائے آگ بجھانے کی کوشش کر تو رہے تھے لیکن محض اس لئے کہ انھیں اپنے مکانوں کے جل جانے کا خوف تھا، ہمدردی کے کسی جذبہ کے تحت نہیں۔ پاس کے مکانوں کی عورتیں باہر گلی میں نکل آئی تھیں۔ شیلا نے بھی چھت سے انھیں دیکھا۔ دھوئیں کے غبار کے کڑوے پن کو محسوس کیا اور اسے خیال آیا کہ وہ بھی نیچے گلی میں چلی جائے۔ اس نے سوتے ہوئے روی

کو گود میں اٹھایا اور چھت سے نیچے اُترنے لگی۔ سیڑھیاں اُترتے وقت اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جس سیڑھی سے وہ اب اُتر چکی ہے دوبارہ اس کو نہ چھو سکے گی۔ جیسے زندگی کی تمامتر وسعتیں اپنا دامن سمیٹتی چلی جا رہی تھیں۔ پھر ایک بار اُسے اپنے خاوند کا خیال آیا۔ اُس نے آج رات واپس پہنچنا تھا۔ کیوں نہیں پہنچا وہ؟ اور اپنے خیالوں میں غرق اندھیرے میں سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ خوف اور نا امیدی کے ملے جلے احساس سے لڑکھڑا گئی اور لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری۔ اس کی کراہیں اور چیخیں محلے میں گونجتی ہوئی آوازوں میں کھو گئیں اور کسی کو اس کا خیال نہ آیا۔

صبح جب سورج نے افق کی فصیل سے کرنوں کے تیز تیز بھالے پھینکنے شروع کئے تو خوف اور افسردگی کے ملے جلے اثرات سے اونگھتے ہوئے انسان جو رات بھر جاگتے رہے تھے دوبارہ تڑپنے لگے۔ اندھیاری کا پردہ ہٹ جانے کے کارن اب ہر کوئی اپنے قریب .... بسنے والوں کو پہچان سکتا تھا۔ رات کی تیرگی میں جن لوگوں کا خیال نہ آیا تھا۔ اب جنتا کی توجہ ان کی طرف بٹنے لگی تھی ——— دروازے کو بہت دیر تک کھٹکھٹانے پر بھی جب کسی نے کنڈی نہ اُتاری تو دو ایک آدمی چھتوں کو پھلانگ کر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ شیلا فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی اور روی سسک سسک کر سو گیا تھا۔ شیلا کی ٹانگوں اور دماغ میں شدید چوٹیں آئی تھیں — اور جب اس کو ہوش آیا تو اس نے خود کو اسپتال کی آہنی چارپائی پر پٹیوں میں جکڑے ہوئے پایا۔ اس کا بچہ روی بھی ساتھ کی چارپائی پر

پڑا تھا۔ اس کے پاس اس وقت کوئی بھی نہ تھا۔ محلے دار بہت عرصہ وہاں رہ کر اب چلے گئے تھے۔ انھیں اپنے مکانوں کی بھی تو فکر تھی۔ شیلا نے خود کو اس اجنبی سے ماحول میں پا کر آنکھیں میچ لیں۔

اور جانے کتنا عرصہ نیم بیہوشی کی حالت میں رہنے کے بعد جب رام ناتھ نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو اسپتال کے مردانہ وارڈ میں کئی اور زخمیوں کے درمیان پڑا پایا۔ زخمیوں کی چیخیں سُن کر اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے موت کی شہنائی بج رہی تھی اور بہت سے لوگوں کا جلوس بڑھ رہا تھا عدم کی طرف۔ جیسے انسانیت مر رہی تھی اور اس کے سرہانے اس کا ماضی اور مستقبل سر پیٹ پیٹ کر چیخ رہے تھے، جیسے اُسکے ساتھ ہی اس کی گذشتہ روایات اور آنے والے دور سے بندھی توقعات دفن ہو جائیں گی اور ارتقا کی مختلف منزال جو اس نے طے کی تھیں نیستی کی ظلمت میں کھو کر اپنا وجود ختم کر دیں گی ——— اور پھر اس کی نظریں اپنے ارد گرد لگی ہوئی چارپائیوں پر گھومنے لگتیں۔ اس کے ساتھی مسافروں میں سے بھی تین چار درد سے کراہ رہے تھے، اور دو ایک کو یہاں لانے کی بجائے شاید پوسٹ مارٹم روم میں داخل کر دیا گیا تھا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ دیو ہیکل سیاہ رنگ کا نوجوان کھڑا ہو جاتا اور اس کا خون آلود خنجر اس کی طرف بڑھنے لگتا اور اُس کے زرد لرزتے ہوئے ہونٹوں میں سے ایک چیخ نکل جاتی، جیسے زخم میں نشتر چبھونے سے خون کی دھار پھوٹ پڑے۔ اس کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ جب نرس صبح اس کا ٹمپریچر لینے آتی تو اس کے دل میں ایک چبھن سی ہوتی۔ وہ اس وقت شیلا کے کومل ہاتھوں کے مس کے لئے تڑپنے لگتا، اس نے اسپتال والوں کو

اپنے گھر کا پتہ بھی دیا تھا پھر نہ جانے کیوں شیلا وہاں نہ پہنچی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اونچے اونچے شعلے لپکنے لگتے اور دھوئیں کے گھنے سیاہ بادلوں کو چیرتی ہوئی شیلا کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجنے لگتیں، جیسے ایک تیز نشتر سے اس کی روح میں کچوکے بھرے جا رہے ہوں۔

وہ شیلا اور روی کو دیکھے بغیر ہی مر جائے گا، دن بھر وہ یہی سوچتا رہتا اور اس سوچ نے مکڑی کی طرح اس کے گرد ایک ایسا گھنا جالا بُن دیا تھا جس کو چیر سکتی تھیں اس کے پہلو میں پھیلے ہوئے بڑے سے زخم میں سے اٹھتی ہوئی ٹیسیں اور پٹی کرتے وقت کمپونڈر کی کرختگی اور تیزی۔ وہ کتنی بے دردی سے زخم کے ساتھ چپٹے ہوئے مرہم و روئی کے ننھے ننھے ٹکڑوں کو چھیلنے کی حد تک اُتارتا تھا۔ وہ ہزار منتیں کرتا کہ ذرا آہستہ آہستہ پٹی کرے لیکن کمپونڈر تو اُسے ایک لاوارث آدمی سمجھے ہوئے تھا جو اُسے کچھ بھی معاوضہ نہ دے سکتا تھا، وہ کیوں اس کی التجا پر غور کرتا اور ہر صبح رام ناتھ کم از کم چند لمحوں کے لئے پٹی کراتے وقت خواہش کرتا کہ کاش وہ مر جائے! شیلا اور روی کو اپنے سرہانے بیٹھے ہوئے دیکھے بغیر ہی وہ زندگی اور موت کی اس چھینا جھپٹی سے چھوٹ جائے ——— اور اُدھر شیلا بھی یہی سوچتی کہ وہ اپنے خاوند کے درشنوں کو ترستی ہی اس دنیا سے اُٹھ جائے گی، اس کا پرلوک میں بھی بھلا نہ ہو سکے گا۔ جانے کیوں اس کا خاوند اب تک واپس نہ آیا تھا۔ اگر وہ واپس آگیا ہوتا تو محلّے والے یقیناً اُسے سب حالات سے آگاہ کر دیتے۔ وہ ہر روز اپنے محلّے والوں سے رام ناتھ کے متعلق پوچھتی اور اس کی دیکھ بھال کو آئے ہوئے لوگ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے سر جھکا لیتے، جیسے انھیں اس کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اپنے

سے زیادہ اپنے خاوند کے خیال نے مسلسل چوٹوں سے شیلا کے دماغ میں ایک علیحدہ زخم کر دیا تھا۔ ایک ایسا زخم جس کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی گہرائی میں اُس کا سہاگ لوٹنے کی سازش ہو رہی تھی۔ اس میں پھیلا ہوا گھنا اندھیرا اس کے ماتھے پر چمکتی ہوئی بندی کی چمک کو نگل رہا تھا۔

آخر ایک شام جب ایک روشن، دہکتی اور شعلے اُگلتی ہوئی بڑی سی آنکھ دن بھر بغیر پلک جھپکے زمین پر رینگتے، الجھتے، کراہتے اور مرتے ہوئے انسانوں کے دل گداز مناظر دیکھ چکنے کے بعد تھک گئی تو نیند کے نازک ہاتھوں نے اُسے ڈھانپ لیا ——— محلّے والوں کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر رام ناتھ کا پتہ لگا لیکن اس وقت وہ زندگی سے اپنا ہر قسم کا ناطہ تقریباً توڑ چکا تھا۔ قطرے کا دریا سے علیحدہ رہنے کا عزم مسلسل شکستوں کے بعد ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ پھر دریا کی وسعت میں سما جانے پر مجبور تھا۔ بڑی کوشش کے بعد ڈاکٹر لوگ اس بات پر راضی ہوئے کہ رام ناتھ مرنے سے پہلے ایک بار اپنی بیوی کو دیکھ لے جو خود بھی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ قطرہ دریا کی وسعتوں میں کھو جانے سے پہلے اپنے ایک آشنا قطرے کے قریب ہو سکے اور ایک بار خود کو اس میں مدغم کر دے ——— اور جب رام ناتھ کی چارپائی اٹھوا کر شیلا کے قریب رکھی گئی تو دونوں متنفس زندگی سے نہیں موت کے دریچوں سے ایک دوسرے کو جھانکنے لگے، اُن کی قوتِ گویائی ختم ہو چکی تھی۔ وہ چند لمحے تھکی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے رہے، ایسی نگاہیں جن میں زندگی کی تڑپ اور موت کے سکون کا امتزاج تھا۔ اور پھر ان ویران نگاہوں میں صرف موت کی خاموشی، تھکن اور اندھیارا باقی تھی۔ اور چار پھٹی پھٹی آنکھیں ایک دوسرے پر جمی تھیں۔

روی بھی چار پائی پر پڑے ہوئے اپنے والدین کو دیکھ رہا تھا۔ جنہوں نے اس کی زندگی سے اچانک اپنا خشک سایہ ہٹا کر اُسے یتیمی کے تپتے ہوئے صحرا میں پھینک دیا تھا اور اس کی معصوم، شفاف اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے رِستے ہوئے آنسوؤں میں ایک اُفق لرز رہا تھا، ایک ایسا افق جو خون کے داغوں، خنجر کی دھاروں اور آگ کے شعلوں سے روشن تھا۔

طلوع و غروب

(ایک تمثیل)

کردار ـــــ

بشن داس ـــــ ایک بوڑھا شرنارتھی
شانتی ـــــ بشن داس کی لڑکی
ہرش ـــــ بشن داس کا لڑکا
بھارت ـــــ ایک نوجوان شرنارتھی
دُرگا ـــــ بھارت کی بیوی۔
بے بی ـــــ اِن کا بچہ۔

نظارہ ـــــ

مشرقی پنجاب کا ایک شرنارتھی کیمپ۔ کھلے میدان میں ایک خاص ترتیب سے خیمے گڑے ہیں۔ درمیان میں تقریباً ۲۵ فٹ چوڑا راستہ چھوڑا گیا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ خیموں میں دُھندلے دُھندلے سے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ خیمہ نمبر ۳۱ کے ایک حصّہ میں مختصر سا سامان قرینے سے رکھا ہے، دوسرے حصّہ میں ٹاٹ کا ایک ٹکڑا بچھا ہے اور اس پر لحاف میں لپٹا پڑا ہے بشن داس، اس کی کھانسی کے جھٹکے کبھی کبھی ساکن فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ آسمان ابر آلود ہے، تیز ہوا چل رہی ہے اور سردی بہت ہے۔ مریض ایک طویل خاموشی کے بعد بولنے کی کوشش کرتا ہے۔

بشن داس :- ہرش بیٹا!

ہرش - جی پتاجی

(شانتی اور ہرش دونوں اس کے قریب آجاتے ہیں)

بشن داس - ڈاکٹر تو پھر نہیں آیا، رات کس طرح گذرے گی؟

ہرش - اس نے یہی دوا پینے کو کہا تھا، کہتا تھا کوئی فکر کی بات نہیں

بشن داس - اچھا...... (آہستہ آہستہ اس پر غنودگی سی چھانے لگتی ہے۔

شانتی - آج جانے کیوں یہ بار بار بے سُدھ ہو جاتے ہیں؟

ہرش - کمزوری زیادہ ہو چکی ہے اس لئے۔ دیکھتی ہو چہرہ کیسے بجھ گیا ہے۔

شانتی - اسپتال میں داخل کرانے سے پہلے تو یہ اچھے تھے۔ اُٹھ بیٹھ سکتے تھے۔ کچھ کھا پی بھی لیتے تھے۔ اب تو حالت اور بگڑ گئی ہے۔

ہرش - اور ڈاکٹر نے اپنی طرف سے تندرست کر کے اسپتال سے ڈسچارج کیا ہے۔ کیا وہ بیماری اور صحت میں فرق بھی نہیں دیکھ سکتے؟

شانتی - اسپتال میں داخل کرایا تھا کہ اُن کی صحت اچھی ہو جائے اس لئے نہیں کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچ اُٹھا کر گھر لے آئیں۔ صبح سے شام تک کتنے ہی لوگ آتے ہیں انھیں دیکھنے کو سب یہی کہتے ہیں کہ ان کی حالت تو پہلے سے بھی خراب ہے اور ڈاکٹر کہتا ہے اب یہ تندرست ہیں۔ پا جی!

ہرش - ایسے ہی ہوتے ہیں یہ ڈاکٹر لوگ - دُکھ اور درد

ہر گھڑی گھرے رہنے کے کارن یہ قوت احساس کھو بیٹھتے ہیں۔ ہر گھڑی چیخوں اور سسکیوں کو سنتے سنتے ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں اور انھیں ایک کمزور جسم سے نکلی ہوئی کمزور آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ لوگ ایک مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔ جس میں احساس کو کوئی جگہ نہیں۔

(ہوا زیادہ تیز چلنے لگتی ہے اور کونے میں صندوق پر رکھے ہوئے چراغ کی مدھم سی لو تھرتھرانے لگتی ہے)

شانتی - ہوا کتنی سرد ہے۔ پردوں میں سے نکل کر تیر کی طرح جسم کو چھیدتی ہے۔

ہرش - ہاں سردی تو بہت ہے۔ اس لحاف کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لو (لحاف اپنے جسم سے اُتار کر اُسے دینے لگتا ہے)

شانتی - میرا مطلب تم سے لحاف چھیننا تو نہیں تھا۔

ہرش - (بات کاٹتے ہوئے) شاید بارش بھی ہو رہی ہے۔

شانتی - (ذرا آگے کھسک کر خیمے کے پردے سے ہاتھ باہر نکالتی ہے) ہاں بوندیں پڑ رہی ہیں۔

ہرش - ٹھہرو، میں دیکھوں خیمے کے اردگرد نالی ٹھیک بنی ہے کہ نہیں۔ اس دن تو پانی خیمے کے اندر بہہ آیا تھا۔

(ہرش خیمے سے باہر نکل جاتا ہے۔ شانتی بھی اس کے پیچھے باہر نکلتی ہے)

شانتی - بارش تو تیز ہے۔

ہرش - ہاں! (اِدھر اُدھر سے مٹی اکٹھی کر کے خیمے کے ساتھ لگانے لگتا ہے) تم اندر چلو پتا جی اکیلے ہیں!

(شانتی اندر آجاتی ہے اور بشن داس کے سرہانے بیٹھکر اسکے
ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے)

شانتی — پتاجی۔ پتاجی (خاموشی)۔ بھیا' او بھیا (گھبرائی ہوئی سی
آواز میں ہرش کو بلاتی ہے)

(ہرش گھبرایا ہوا اندر داخل ہوتا ہے)

ہرشں۔ کیوں!

شانتی۔ ان کا ماتھا تو دیکھو کیسے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

(ہرش مٹی سے اَٹے ہاتھوں کو دھوکر بشن داس کے قریب آجاتا
ہے۔ اُس کے ساتھ ہوا کا ایک تیز جھونکا بھی اندر داخل ہوتا ہے
شانتی کانپ اٹھتی ہے)

ہرشں۔ میرے خیال میں انھیں برانڈی کی کچھ بوندیں دے دینی چاہیں

شانتی۔ ہاں ٹھیک ہے۔

ہرشں۔ پتاجی۔ پتاجی۔ (خاموشی) پتاجی، پتاجی (چہرے پر جھک
کر پھر آوازیں دیتا ہے)

بشن داس۔ (بڑبڑاتے ہوئے) مجھے اور میرے لڑکے کو مار
ڈالو۔ لیکن شانتی کو چھوڑ دو۔

ہرشں۔ پتاجی۔ کیا ہے؟

بشن داس۔ (ڈرڈر کر آنکھیں کھولتا ہے اور چند لمحوں کے لئے
خیمے کو غور سے دیکھتا ہے جیسے پہچان رہا ہو) ہرش بیٹا؟

ہرشں۔ جی پتاجی۔

بشن داس۔ شانتی کہاں ہے؟

شانتی۔ میں آپ کے پاس بیٹھی ہوں پتاجی (اپنا سر بشن داس کی چھاتی
پر رکھ دیتی ہے)

بشن داس۔ اب شانتی تمھارے حوالے ہے ہرش!

(شانتی کی آنکھوں میں آنسوں بھر جاتے ہیں اور وہ سسکنے لگتی ہے)

ہرشں۔ برانڈی کی چند بوندیں ڈال دو ان کے منہ میں۔

(شانتی اٹھتی ہے اور شیشی سے تھوڑی سی برانڈی پیالی میں ڈال
کر ہرش کو دیتی ہے)

ہرشں۔ لو پتاجی۔ (بشن داس پر پھر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ
جواب نہیں دیتا)

شانتی۔ وہ تو پھر بے ہوش ہو گئے۔

(بارش اور تیز ہو جاتی ہے اور وہ دونوں بھی سردی محسوس
کرنے لگتے ہیں)

ہرشں۔ یہ لحاف بھی پتاجی کے اوپر ڈال دو۔ شاید انھیں بھی سردی
لگ رہی ہو۔

(شانتی ایک اور لحاف بشن داس کے اوپر ڈال دیتی ہے اور دونوں
بہن بھائی سکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں)

شانتی۔ آج جانے کیوں میرا دل ڈوب رہا ہے؟

ہرشں۔ زندگی مجموعی طور پر نڈھال ہے شانتی۔ فضا میں ہزاروں
بیکسوں، یتیموں اور زخمیوں کی کراہیں بسی ہوئی ہیں۔ یہ سب
اس کا اثر ہے۔ یاس اور نا امیدی کا گھنا سایہ ہمارے مستقبل
کو دھندلا کر رہا ہے۔ صرف فرد کا ہی نہیں تمام قوم کا دل ڈوب

رہا ہے، دھرتی کا دل ڈوب رہا ہے بہن۔

شانتی - درندگی کے اس دور سے نکل کر اقتصادی بدحالی اور خانہ بدوشی کے چکر میں آ پھنسے ہیں۔ کیا بنے گا ہم لوگوں کا؟

ہرشش - جو انقلاب کے بعد ہر قوم کا بنتا ہے۔ جو فرانس کا بنا تھا، جو روس کا بنا تھا وہی ہمارا بنے گا۔ ہم دوسرے ملکوں پر لاگو ہونے والے قدرتی اصولوں سے بچ نہیں سکتے۔

شانتی - کبھی خواب میں بھی سوچا تھا کہ ایک دن یوں ہم زمین پر بچھانے کے لئے پھٹے پرانے ٹاٹ کے ٹکڑے کو ترسیں گے اور سرما کی طویل راتوں میں اوپر ڈالنے کو کچھ میسر نہ آئے گا۔ ایک پھٹی پرانی قمیص اور رضائی کے لئے ہمیں ہاتھ پھیلانے ہوں گے۔

ہرشش۔ اس کی توقع شاید کسی کو بھی نہ تھی۔

شانتی - جب کبھی ان بھیانک نظاروں کا خیال آ جاتا ہے تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ انسانیت نے کتنے گہرے زخم کھائے ہیں۔ میری مستقل ذہنی اذیت کا باعث پاس کے خیمے میں رہنے والا وہ نوجوان ہے جس کے دونوں ہاتھوں اور ایک پاؤں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ کتنا خوبصورت ہے وہ لڑکا اور کتنا محتاج!

ہرشش - کتنی خوبصورت ہے یہ زندگی اور کتنی اپاہج! قدرت کے سامنے یہ بھی ہاتھ پیر کٹے نوجوان کی طرح ہے جس کا جوش صرف اس کے اپنے سینے کو جلا سکتا ہے، جس کا غصہ صرف اس کے اپنے دماغ کو ہی جھلس سکتا ہے۔ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

شانتی - پچھلے دنوں انسانیت کے سینے پر جو گہرے زخم لگائے گئے

ہیں کیا وہ کبھی ٹھیک ہو سکیں گے۔ کیا وہ آنے والی کئی صدیوں تک ناسور بن کر نہ رستے رہیں گے۔ وہ یقیناً رستے رہیں گے اور انسانیت کراہتی رہے گی، تڑپتی رہے گی۔

ہرشش - اور آگے بھی بڑھتی رہے گی۔ انسانیت نے کئی بار پہلے بھی زخم کھائے ہیں اور ہر بار وہ زخم بھرے ہیں۔ ہمارا کمزور نڈھال اور جاں بہ لب ماضی بہ نسبت اُجلے مستقبل کے ہمارے زیادہ قریب ہے اس لئے ہم اسے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وگرنہ چاند اور تاروں کے ڈوب جانے کے بعد ذرّے ذرّے کو منور کرنے والا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔

شانتی - مگر آسمان بھی تو کالی گھٹاؤں سے اٹا پڑا ہے۔ رات کے ختم ہونے کے بعد بھی اندھیرا ہی رہے گا۔

ہرشش - اور یہ جھکڑ اور درختوں کو جڑ سے اُکھاڑ دینے والی آندھی کیا روئی کے ان بوسیدہ پرانے اور میلے گالوں کو بھی نہ اُڑا سکے گی یہ سب دھجے پھٹ جائیں گے۔ آسمان دُھلی ہوئی نیلی چادر کی طرح نکل آئے گا اور اس سے جھانکے گا سنہرا آفتاب۔

شانتی - (بشن داس کے جسم کو چھوتے ہوئے) پتاجی کا جسم تو پہلے سے بھی زیادہ سرد ہو رہا ہے۔ ہیں! یہ کیا۔ منہ سے جھاگ نکل رہا ہے ہرشش۔

ہرشش - (قریب جا کر بشن داس کی نبض پر انگلیاں رکھتا ہے) ان کی نبض تو ڈوب سی رہی ہے۔ ٹھہرو میں ابھی کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں (گھبرایا ہوا خیمے سے باہر نکل جاتا ہے)

شانتی - پتاجی، پتاجی۔ بولئے تو سہی۔ آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ رہے ہیں۔ ابھی چند روز پہلے آپ اپنی جان دے کر مجھے بچانے لگے تھے۔ اب کیا ہوگیا ہے؟ آپ کے بعد میرا بوجھ کون اٹھائے گا؟

(سسکیوں کی آواز خیمے سے اُبھرنے لگتی ہے)

(چند لمحوں کے بعد مریض کے جسم میں کچھ حرکت ہوتی ہے۔ یہ آخری لمحوں کی اینٹھن ہے۔ وہ پھر ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھولتا ہے اور بیٹی کو پکارتا ہے)

بشن داس۔ شا.... نتی (آواز نہایت کمزور اور دھیمی ہے)

شانتی - جی پتاجی۔

(مریض کے چہرے پر جھکتی ہے اور ماتھا پیٹ لیتی ہے۔ مریض کا چہرہ ایک طرف لڑھک جاتا ہے اور منہ سے جھاگ اُبل پڑتا ہے خیمے میں ہوا کا ایک تیز جھونکا داخل ہوتا ہے اور کونے میں رکھا ہوا چراغ بجھ جاتا ہے)

شانتی - ہائے میں لٹ گئی (بارش تیز ہو جاتی ہے جس کے شور میں اُس کی چیخیں بھی ڈوب جاتی ہیں)

ہرشس۔ شانتی! ڈاکٹر تو نہیں ملا۔

شانتی - اور اب اُس کی ضرورت بھی نہیں (وہ اور زور سے رونے لگتی ہے)

(بجلی ایک بھیانک آواز سے کڑکتی ہے اور خیمے کا اندرونی حصہ ایک لمحہ کے لئے روشن ہو جاتا ہے)

---

(۲)

نظارہ

وہی شرنارتھی کیمپ۔ ایسی ہی ایک طوفانی رات ہے۔ سوائے بجلی کی کڑک، بارش کی آواز اور جھکڑ کے شور کے کوئی آواز نہیں۔ جس کسی خیمے میں بارش کا پانی داخل ہونے لگتا ہے۔ اس میں رہنے والے شرنارتھی خیمے کے باہر مٹی تھوپنا شروع کر دیتے ہیں۔ خیمہ نمبر ۳۱ کے سامنے خیمہ نمبر ۴۷ ہے مدھم سا چراغ جل رہا ہے۔

(بارش اور مٹی تھوپنے کی آواز)

درگا - جانے بے بی کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ پیدا ہونے کے روز سے ہی بیچارہ تکلیفیں دیکھ رہا ہے۔

بھارت۔ ابھی جانے اُسے کیا کچھ اور دیکھنا ہوگا۔ یہ معصوم آنکھیں جن میں زندگی کی شیتل چاندنی ہے، جہاں موت کے تانڈو ناچ کی ہلکی سی گونج بھی نہیں، ابھی جانے کیسے کیسے المناک مناظر دیکھیں گی۔

درگا - کیا پہلے نظارے کم بھیانک تھے۔ تمہیں اس کا جنم دن یاد ہے نا؟

بھارت۔ یاد کیوں نہیں؟ ۱۵ر اگست ہی تو تھا۔ اس کی آمد کا چرچا تو پہلے ہی سے ہونے لگا تھا۔ اور پیدائش کے بعد تو گویا فضا میں ایک برقی رو دوڑ گئی تھی اور گھر گھر یہ سندیسہ دے آئی تھی کہ بھارت کے گھر بچہ پیدا ہوا تھا۔

درگا۔ اور میری کیا حالت تھی اس وقت؟

بھارت۔ تم اسپتال کے ایک کمرے میں بے سدھ پڑی تھیں۔ کبھی کچھ لمحوں کے لئے تمہیں ہوش آتا تھا اور پھر تم بے ہوش ہو جاتی تھیں۔

دُرگا ۔ ڈاکٹروں کا کیا خیال تھا میرے متعلق ؟

بھارت ۔ وہ پُرامید نظر آتے تھے ۔ اُن کے چہروں پر تشویش کے نشان ضرور تھے لیکن ان کی آنکھوں میں امید کی مدھم سی چنگاری روشن تھی ۔

درگا ۔ اور ہمارے اپنے لوگ کیا کہتے تھے ؟

بھارت :۔ اُن کا خیال تھا کہ تم صحت یاب نہ ہو سکو گی ۔ وہ آپس میں فکر سے سرگوشیاں کرتے تھے ۔ کہ اوّل تو بچہ پیٹ ہی میں مرجائے گا اور اگر زندہ پیدا ہو بھی گیا تو دُرگا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا ۔

دُرگا ۔ اور جب انھیں یہ خبر ملی کہ بچہ بھی زندہ ہے اور بچے کی ماں بھی خطرے سے باہر ہے تو پھر کیا کیا انھوں نے ؟

بھارت :۔ وہ ایک غیر متوقع عمل کے مرتکب ہوئے ۔ انھوں نے ایک جنگلی ناچ ناچا جس میں وہ شعلوں اور بھالوں سے کھیلے ۔ جس میں انھوں نے خون کی پھاگ سے خود کو رنگ ڈالا ۔ انھوں نے عورتوں کی عصمت معصوم بچوں کی ہتیا کی شراب پی اور پھر ایک اندھی غار سے حیوانیت اور بربریت کا دیو چنگھاڑتا ہوا باہر آیا ۔

درگا ۔ دیو کے غار سے باہر نکل آنے کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے معلوم ہے صرف اس سے پہلے کی باتیں مجھے معلوم نہ تھیں کیونکہ میں پوری طرح ہوش میں نہ تھی ۔

بھارت ۔ تم تو ابھی تک پوری طور پر صحت یاب نہیں ہو سکیں ۔ ابھی تم بہت کمزور ہو ۔

درگا ۔ اب مجھے اپنی فکر نہیں ۔ اب میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکی ہوں ۔ عورت کی سب سے بڑی فکر بچے کی تخلیق ہے ۔ اس کے بعد

اگر وہ زندہ رہتی ہے تو فقط بچے کو پالنے کے لئے ۔ اب مجھے خیال ہے تو صرف بے بی کا ۔ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر لوگ ؟

بھارت ۔ ان کا خیال ہے کہ بچہ کمزور ضرور ہے اور یہ کمزوری غالباً اس لئے ہے کہ تم خود کمزور تھیں ۔ بچہ عارضی طور پر کبھی کبھی بیمار ہو سکتا ہے لیکن اس سے اس کی بڑھوتی پر کوئی نمایاں اثر نہ پڑے گا ۔

درگا ۔ یعنی یہ ایک نارمل انسان کی طرح دنیا میں بسنے والے لوگوں کے دوش بدوش چل سکے گا ؟

بھارت ۔ یقیناً

(درگا بھارت کی طرف دیکھتی ہے اور دونوں کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے چمک اٹھتی ہیں)

دُرگا ۔ زندگی کی تخلیق کتنا مشکل اور وقت لینے والا کام ہے اور موت کتنا آسان اور جلد مکمل ہو جانے والا واقعہ ۔ دردِ زہ اور موت کی اینٹھن کا مقابلہ ہی کیا ؟

بھارت ۔ مگر کبھی نئی تخلیق کے لئے زندگی کو کئی بار موت کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے ۔

(بے بی کھانسنے لگتا ہے اور پھر رونا شروع کر دیتا ہے)

درگا ۔ آج بے بی کی طبیعت زیادہ خراب ہے ۔ جسم بھی تپ رہا ہے ۔ اور سانس لیتے وقت گلے میں خراش سی ہوتی ہے ، جیسے سانس کو زور دے کر باہر نکالا جا رہا ہو

بھارت :۔ (بے بی کے جسم کو چھو کر) ہاں جسم تو تپ رہا ہے ۔ اسے برانڈی کی ہی دو ایک بوندیں دے دو ۔ صبح ڈاکٹر کو دکھاؤں گا ۔

درگا۔ برانڈی کی شیشی تو کل ٹوٹ گئی۔ اس میں تو اب ایک بوند بھی نہیں

بھارت۔ احتیاط سے کام لیا کرو درگا۔ اب چیزوں کو توڑنے کا وقت نہیں انھیں سنبھال کر رکھنے کا وقت ہے۔ خاص کر عورت کے ہاتھ سے کسی چیز کے ٹوٹ جانے پر مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ عورت جس کا کام تخلیق ہے، جو دنیا کو خوبصورتی، معصوم مسکراہٹیں، جادو بھری باتیں اور زندگی دیتی ہے زندگی کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ اور تم عورت ہو اور تم نے برانڈی کی شیشی توڑ دی ہے جس میں حرارت ہے، سرور ہے، زندگی ہے۔

درگا۔ شیشی کے ٹکڑے ابھی تک خیمے میں ہی پڑے ہیں۔ میں نے باہر تو نہیں پھینکے۔

بھارت یہ تمھاری دوسری حماقت ہے۔ چیزوں کو توڑنے سے ہمیشہ گریز کرو۔ لیکن جب وہ ٹوٹ جائیں تو انھیں فوراً باہر پھینک دو۔ نہیں تو یہ چھوٹے چھوٹے تیز اور نکیلے ٹکڑے تمھارے ہاتھ پاؤں لہولہان کر دیں گے۔ بے مصرف انسانی بڑھوتی کو ختم کرنے کے لئے بھی اٹھا کرتی ہیں یہ آندھیاں، سُلگا کرتی ہے یہ آگ، اور بہا کرتا ہے یہ گرم گرم سُرخ خُون۔

درگا کیا کم خون بہا ہے ابھی دنیا میں۔

بھارت۔ خون کی اس سُرخی کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ آفتاب کے ڈوبتے وقت افق پر پھیلی ہوئی سُرخی جس کے دامن میں سیاہی کی تہیں لپٹی ہوتی ہیں اور صبح سویرے مشرق میں رکھی ہوئی شفق جو طلوع آفتاب کا پیغام ہے جس میں زندگی کا راگ ہے، گرمی ہے،

مسرت ہے اور ابھی معلوم نہیں کہ یہ سُرخی کس افق پر پھیلائی جائے گی۔ یہ سرخی کس کا حصّہ ہے؟ یہ خون کسی حسین صبح کا سندیسہ ہے یا کسی تلخ شام کا؟

(بے بی پھر کھانستا ہے اور رونا شروع کر دیتا ہے)

دُرگا۔ رات جانے کتنی باقی ہے؟ بے بی کی حالت اچھی نہیں۔

بھارت۔ اسے ذرا قہوہ ہی پلا دو۔ شاید طبیعت سنبھل جائے۔

درگا۔ قہوہ سے کیا بنے گا؟

بھارت۔ تم پلا تو دیکھو، کیا حرج ہے اس میں! شاید سردی کی وجہ سے طبیعت بگڑ رہی ہو۔

درگا۔ بہت اچھا۔

(کچھ وقفہ — جس میں برتنوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آواز ابھرتی ہے)

دُرگا۔ بارش تو زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ اِن خیموں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ کب تک رہنا ہو گا ہمیں یہاں اِن خیموں میں؟

بھارت۔ جب تک سرکار ہمارے لئے جھونپڑیوں کا انتظام نہیں کرتی۔

درگا۔ کب ہو گا جھونپڑیوں کا انتظام؟

بھارت۔ جب یہ اونچے اونچے کنگارے زمین کے ساتھ مل جائیں گے۔ جب اونچے منارے اور گہرے گڑھے آپس میں سمجھوتہ کر چکیں گے۔ جب زندگی کی پرانی قدریں خود کو نئی قدروں میں سمو دیں گی، جب وار کرنے والے ہاتھ وار کرنے کی بجائے زخموں پر پھاہے رکھیں گے۔

درگا۔ اور ایسا کب ہو گا؟

بھارت جب یہ تیز بارش اور تند جھکڑ تھک کر ہار جائیں گے۔ جب زندگی پر اثر انداز ہونے والی تخریبی قوتیں اپنا رُخ دوسری طرف بدل لیں گی۔

درگا – تھوڑے سے کچھ فرق تو ہو گیا ہے۔ اب بے بی کم کھانستا ہے۔

بھارت – جب کسی تخلیق کو شاہکار بننا ہو تو آرٹسٹ کے برش کے آڑے ترچھے اور فضول خطوط بھی سُندر تھا اور آرٹ کا روپ بھر کر رقص کرنے لگتے ہیں۔

(آندھی کا ایک تیز جھونکا اندر آتا ہے اور مدھم سا چراغ بجھ جاتا ہے)

دُرگا – (خوفزدہ ہو کر) اُف چراغ بھی بجھ گیا!

بھارت – (خیمے سے باہر جھانک کر) اور اب اس کی ضرورت بھی نہیں۔ پُورب میں گھُٹتی ہوئی اندھیرے کی تہیں رفتہ رفتہ اُدھڑ رہی ہیں اور آندھی کے تیز جھونکے انھیں دور گہرے غاروں کی طرف دھکیل رہے ہیں)

(درگا بھی اس کے نزدیک آجاتی ہے اور باہر جھانکتی ہے)

درگا – ہاں اب تو پربھات ہونے والی ہے۔

بھارت – اب خون کی سُرخی بانٹی جائے گی۔ اب اندھیرے اور اُجالے کی تقسیم ہو گی اور تھوڑے ہی عرصہ میں سورج کی زندگی بخش کرنیں ہمارے ان بھیگے ہوئے تاریک خیموں کو جگمگا دیں گی۔

(بے بی بھارت کی طرف ہمکنے لگتا ہے اور بھارت اُسے چوم لیتا ہے)

بارہ مُولہ کی موت

لُٹیرے بڑھتے بڑھتے بارہ مولہ میں پہنچ چکے ہیں مہورہ کے بجلی گھر پر اُن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ کشمیر کی حسین وادی گہری اندھیاری میں ڈوب گئی ہے۔ فضا جس میں ایک ہراس بھرا ہے توپ کے گولوں اور بندوق کی گولیوں سے اکثر گونجتی رہتی ہے۔

نظارہ

بارہ مولہ کا قصبہ جسے بچانے کے لئے سوائے ریاست کی تھوڑی سی فوج جو جگہ جگہ بکھری پڑی ہے اور نیشنل ملیشیا کے کچھ نہیں۔ لوگوں کے دل خوف سے ڈوبے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی ڈھول کی آواز اور لٹیروں کا شور سنائی دے جاتا ہے اور پھر گولیوں کی آوازوں سے وادی گونج اٹھتی ہے۔ بازار میں چوک کے قریب ایک دو منزلہ مکان ہے جس کے ایک کمرہ میں کئی عورتیں اور بچے جمع ہیں۔ طاق میں رکھا ہوا چراغ اتنا عرصہ جلنے کے بعد ابھی ابھی بجھا ہے۔

رُکمنی – اُف یہ چراغ بھی بجھ گیا۔ امید کا آخری تارہ بھی پاتال کی گہرائیوں میں کھو گیا۔

سیوا سنگھ ۔ جب مہورہ کا بجلی گھر جو آدھی ریاست کو روشن کر سکتا تھا ہم سے لٹیروں نے چھین لیا تو اس مٹی کے دیئے کے بجھ جانے کا کیا افسوس۔ اب صرف ہمارا گھر ہی نہیں، تمام بارہ مولہ، تمام سرینگر اندھیرے میں سسک رہا ہے اور دشمنوں کے آخری وار کا انتظار کر رہا ہے۔

رُکمنی ۔ مگر اب تو سنا ہے کشمیر نے ہند یونین میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اب تو اُن کا فرض ہے کہ وہ کشمیر کی جنتا کو اس بربادی اور تباہی سے بچائیں۔

سیوا سنگھ ۔ انھیں اپنے فرض کا احساس ہے۔ وہ کشمیر کے دُکھ سکھ کو اپنا دُکھ سکھ سمجھتے ہیں۔ کشمیر کی آن ہندوستان کی آن ہے۔ کوہ ہمالہ ہندوستان کا مکٹ ہے۔ وہ یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی اس سنہرے مکٹ کو چھونے کی جرأت کرے؟

رُکمنی ۔ اب اس سے زیادہ بھیانک سمے اور کون ہوگا؟ کیا وہ اس وقت ہماری مدد کو آئیں گے جب کشمیر کی حسین وادی میں گدھ انسانی لاشوں کو نوچتے ہوں گے اور جہلم ندی کا پانی خون کی ملاوٹ سے سُرخ بن چکا ہوگا؟

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز۔ گفتگو بند ہو جاتی ہے اور کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ ڈر جاتے ہیں —— چند لمحوں کی خاموشی پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

رُکمنی ۔ (سرگوشی کے سے انداز میں) کون ہے؟

سیوا سنگھ ۔ (دھیمی آواز میں) ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔

رُکمنی ۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ کل کی بات یاد نہیں کیا؟ اس طرح

دروازہ کھٹکھٹا کر تو مکان کے اندر داخل ہوتے تھے لٹیرے اور ظالموں نے شیلا کے باپ کو مار ڈالا اور اُسے اٹھا کر لے گئے۔

سیوا سنگھ ۔ مگر مقبول بھی تو باہر ہے شاید وہی ہو۔

(دروازہ اب کے زور زور سے کھٹکھٹایا جاتا ہے)

رُکمنی ۔ وہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ جلدی سے دروازہ کھولو۔ (آہ بھر کر) ہائے واہگورو جی۔

(سیوا سنگھ جلدی میں دروازہ کی طرف بڑھتا ہے اور گھر کی مختلف چیزوں سے ٹھوکر کھاتا ہے)

رُکمنی ۔ یہ ٹارچ تو لے جاؤ۔ اور بہت احتیاط سے دروازہ کھولنا۔

(دروازہ کھولنے کی خفیف سی آواز)

سیوا سنگھ ۔ کون؟

رمضاناں ۔ میں ہوں رمضاناں، مجھے جلد اندر آنے دو۔

رُکمنی اور کمرے کی عورتیں ۔ تم کہاں رہے؟

رُکمنی ۔ مقبول کا بھی کچھ پتہ ہے؟

رمضاناں ۔ مقبول بھائی کے متعلق تو میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں ہندوستانی فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے اُتر رہی ہیں۔ کل دوپہر تک ان کا کچھ حصہ اس طرف کوچ کرے گا۔

رُکمنی ۔ تو اکیلا اِس گھُپ اندھیرے میں کہاں گھوم رہا ہے؟

رمضاناں ۔ میں اکیلا تو نہیں بال سینا کے اور بہت سے میرے ساتھی ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ ہمارے ذمے لوگوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور کرنے کا کام ہے۔

ایک آواز ۔ وھنیہ ہو بیٹیا ۔

دوسری آواز ۔ بال سینا لڑنے والی فوج سے زیادہ کام کر رہی ہے ۔

تیسری آواز ۔ واہگورو تیری اوٹ

رمضاناں ۔ (سب سے مخاطب ہو کر) تم گھبراؤ مت کل شام تک ہندوستانی فوجیں لٹیروں پر حملہ بول دیں گی ۔ اچھا اب میں جاتا ہوں

سیوا سنگھ ۔ (حیرت سے) اس وقت ؟ اب کہاں جاؤ گے ؟

رمضاناں ۔ ہم نے ہر گھر میں یہ پیغام پہنچا کر صبح سے پہلے واپس راجدھانی میں پہونچنا ہے ۔

(رمضاناں چلا جاتا ہے)

سیوا سنگھ ۔ مقبول جانے کب واپس آئے گا ! کہیں دشمنوں کے ہی ہاتھ نہ آگیا ہو ۔ میں نے اُسے کہا بھی تھا کہ آج مجھے جانے دو ۔ ہر روز تم ہی اپنی جان ہتھیلی پر رکھتے ہو ۔ آج مجھے بھی اس کا لطف دیکھنے دو ۔ نہیں مانا کم بخت ۔

رُکمنی ۔ تم دونوں میرے لئے ایک مصیبت ہو ۔ تم چند آدمی ان ان گنت درندوں کا مقابلہ کر سکتے ہو جن کے جبڑے خون سے بھرے ہیں ۔

سیوا سنگھ ۔ ہم شاید ایک آدھ دن میں قتل کر دیئے جائیں ۔ ہمیں شاید زندہ جلا دیا جائے ۔ تمھیں اپنی عزت بچانے کے لئے شاید اپنے سینے پر پستول رکھنا پڑے ۔ یہ معصوم بچے جو اس وقت ہماری حفاظت میں ہیں شاید ہماری آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں لیکن جو زندہ بچ جائیں گے وہ دیکھیں گے کہ ایک دن یہ وادی لٹیروں سے پاک کر دی جائے گی ، یہاں فتح کے گیت

گائے جائیں گے اور کشمیر آزاد ہوگا ۔

رُکمنی ۔ عورتوں کے سہاگ لٹ جائیں گے ، بچوں کے باپ مر جائیں گے بہنوں کے بھائی نہ رہیں گے تو کون گائے گا فتح کے ترانے ، کون سنے گا آزادی کے گیت ؟

سیوا سنگھ ۔ خوبصورت وادی کا احاطہ کئے ہوئے یہ پہاڑ ، یہ اونچے اونچے سفیدے کے درخت ، یہ نالے کا گنگناتا ہوا پانی ۔

رکمنی ۔ جب یہ پہاڑ اپنی بڑی بڑی چٹانیں لڑھکا کر دشمنوں کو کچل نہیں سکے یہ اونچے اونچے درخت خود کو راستہ میں گرا کر انھیں آگے بڑھنے سے روک نہیں سکے ، یہ نالہ متلاطم ہو کر انھیں ڈبو نہیں سکا تو انھوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا ۔ انھوں نے کشمیر کے ساتھ دھوکا کیا ہے ، بھارت ماتا کے ساتھ دھوکا کیا ہے ۔

سیوا سنگھ ۔ پہاڑ کبھی دشمن کو نہیں روکتے ۔ درخت کبھی ان کے راستے میں حائل نہیں ہوتے ۔ ندیاں کبھی انھیں غرق نہیں کرتیں ۔ دشمن کو تباہ کرتے ہیں ۔ وطن کے سپوت ، آزادی کے پجاری ، عزت اور ناموس کی خاطر کٹ مرنے والی عورتیں ، ظلم کے سامنے سینہ تانے کھڑے نوجوان ۔ پہاڑ اُن کے جنگی ترانے گونجائیں گے ۔ درخت ان کے سندیسے دور تک پہنچائیں گے اور یہ ندیاں اُن کی راکھ کو دشمن سے محفوظ دور سمندر میں لے جائیں گی ۔

(ڈھول کی آواز سے رات کی خاموشی گونج اٹھتی ہے)

ایک آواز ۔ ابھی رات کتنی باقی ہے ؟

دوسری آواز ۔ شاید دو بجے ہیں ۔

سیوا سنگھ ۔ میرا خیال ہے تم سب تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ ۔ یہاں تو ہر رات یہی حال ہے ۔ ہر ایک رات تو جاگ کر نہیں کاٹی جا سکتی ۔

تیسری آواز ۔ مگر خوف میں نیند کہاں آتی ہے ۔

(چیخوں کی اونچی آوازیں جو شور میں حل ہو رہی ہیں)

رُکمنی ۔ ہیں ! یہ شور کیسا ہے ؟

سیوا سنگھ ۔ کسی مکان پر حملہ ہو گیا ہے شاید ۔

رُکمنی ۔ (کمرے سے باہر نکل کر) وہ دیکھو شعلے نکل رہے ہیں ۔ وہ کہیں گوردوارہ تو نہیں ؟

سیوا سنگھ ۔ (کچھ وقفہ کے بعد) گوردوارہ ہی تو ہے ۔ ہندو اور سکھوں کی بہت بڑی تعداد اس میں جمع تھی ۔ کیا بنا ہوگا غریبوں کا ؟

(گولیوں کی آوازیں)

رُکمنی ۔ بھاگتے ہوئے لوگوں پر گولیاں چلا رہے ہیں ۔ (ایک اور گولی کی آواز) ۔ یہ تو کہیں پاس ہی چلائی گئی ہے ۔ بال سینا میں کام کرنے والے بچے بھی تو شہر میں گھوم رہے تھے ۔

(کمرے میں کھسر پھسر کی آوازیں)

سیوا سنگھ (قدرے غصے سے) خاموش بیٹھے رہو سب لوگ ۔ لٹیرے پاس کی گلی میں چکر کاٹ رہے ہیں ۔ انھیں اگر یہاں زندگی کا کوئی بھی نشان مل گیا تو سب قتل کر دیئے جاؤ گے ۔ یہ رات کا وقت ہے گھور اندھیرا ہے اور اندھیرے میں کھایا ہوا زخم کسی کو نظر نہیں آتا ۔

(گلی میں کسی کے گرنے اور پھر کراہنے کی آواز)

رُکمنی ۔ (سیوا سنگھ سے) وہ لگی ہے گولی کسی کو ۔ کواڑ بند کر لو ۔

سیوا سنگھ ۔ کواڑ کیوں بند کرتی ہو ۔ مجھے آکاش تک پہنچے ان شعلوں کو دیکھنے دو جن میں سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے زندہ جل رہے ہیں صرف اس لئے کہ وہ بے گناہ ہیں، وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں ۔ مجھے اس وادی میں گونجتی ہوئی چیخوں کو سننے دو جن میں صدیوں تک جمود کی دلکشی بسی رہی ہے ۔

رُکمنی ۔ پاگل نہ بنو ۔ وہ بے مقصد گولی چلا رہے ہیں ۔ برآمدے میں کھڑا رہنا خطرہ سے خالی نہیں ۔ ابھی تمھارے سامنے گلی میں ایک آدمی گرا ہے

سیوا سنگھ ۔ (جذباتی انداز میں) کل انھوں نے گرجا جلایا تھا ۔ شانتی اور امن کے پیامبر حضرت عیسےٰ کے ٹکڑے کئے تھے ۔ کرنل ڈائیکس اور تین راہباؤں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا ۔ صرف اس لئے کہ انھوں نے خدا کے گھر کو تباہ نہ کرنے کی درخواست کی تھی ۔ آج وہ گوردوارہ جلا رہے ہیں ، کل وہ مندر جلائیں گے ۔ انسانیت کا جنازہ اٹھا رہے ہیں وہ لوگ اور میں انسان ہوں اور تم مجھے اس جنازے کو دیکھنے سے روکتی ہو ۔

رُکمنی ۔ جنازہ دیکھنے سے مرنے والے کو کیا فائدہ پہنچے گا ؟

سیوا سنگھ ۔ مرنے والا سکون سے شعلوں کی گود میں لیٹ سکتا ہے ۔ اسی لئے ماتمی جلوس نکالے جاتے ہیں ورنہ چار آدمی تو کیا صرف ایک آدمی لاش کو چھکڑے میں لاد کر شمشان تک لے جا سکتا ہے ۔

ایک آواز ۔ اندر آجاؤ بیٹا ، ضد نہ کرو ۔

دوسری آواز ۔ اپنے لئے نہیں تو ہماری خاطر ہی آجاؤ ۔

سیوا سنگھ ۔ (آہستہ سے) بزدل، موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں یہ لوگ!
(قدرے اونچی آواز میں) بہت اچھا ۔ (دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور کمرہ میں مکمل خاموشی چھا جاتی ہے)

عنایت اللہ کاٹھو کے مکان کا ایک کمرہ ۔ لٹیروں کا سردار اور کچھ لٹیرے بیٹھے ہیں ۔ باہر آنگن میں بکرے بھونے جا رہے ہیں ۔ ایک طرف اغوا کی ہوئی عورتیں جمع کر رکھی ہیں اور درمیان میں بندوقیں تانے ہیبتناک پٹھان کھڑے ہیں ۔ عورتیں بکروں کے آگ میں جھلسنے کا منظر دیکھ رہی ہیں ۔ اُن کے چہروں پر غم اور خوف کی گہری چھاپ ہے ۔

سردار ۔ (عنایت اللہ سے مخاطب ہو کر) کیوں میاں کاٹھو خوش ہو (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) تمھیں تکلیف تو نہیں ہو رہی؟ یہ رسے ہیں بھی بہت موٹے ۔ ذرا ڈھیلے کر دو کاٹھو کے رسے ۔

پہلا پٹھان ۔ بہت اچھا ۔

سردار ۔ کل تک یہ مکان تمھارا تھا ۔ آج اس کے مالک ہم ہیں ۔ چند روز پہلے یہ بارہ مولہ کشمیریوں کا تھا اب پٹھانوں کا ہے ۔ تم نے پٹھان کا مدد کیا لیکن پٹھان نے تم کو رسوں میں جکڑ دیا ۔ (پاؤں سے ٹھوکر لگا کر) معلوم ہے کیوں؟

عنایت اللہ ۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے غداری کی ہے اس لئے ۔

سردار ۔ ہم پٹھان ہمدردی وردی کچھ نہیں جانتا ۔ ہم صرف سونا دیکھتا ہے ۔ تمھارے پاس بہت سونا ہے اور بہت خوبصورت عورت ہے ہم ہم بارہ مولہ کو لوٹے گا، سرینگر کو لوٹے گا، تمھاری عورتوں کی عزت لوٹے گا ۔ پھر یہ سب سونا اور عورت ہم پشاور لے جائے گا، غزنی

لے جائے گا، کابل لے جائے گا وہاں ہمارا دوست مزے لوٹے گا ۔

عنایت اللہ ۔ (درد سے کراہتے ہوئے) میں نے تو تمھاری مدد کی ہے ۔

سردار ۔ اس لئے ہم تمھاری عورت کو تمھارے سامنے ننگا کرے گا ۔ تمھارے ملک کی سب اچھی چیزیں تمھارے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہیں ۔ محمود غزنوی کے لئے ہیں ۔ نادرشاہ کے لئے ہیں ۔ ہلاکو کے لئے ہیں ۔ مگر تم اب کیوں کراہ رہے ہو ۔ تمھارے رسے تو ڈھیلے کر دیئے گئے ہیں ۔ کہاں ہے درد تمھیں؟

عنایت اللہ ۔ میرے کلیجے میں زخم ہے جو رسوں کے ڈھیلے ہو جانے پر بھی دکھتا ہے ۔

سردار ۔ ہم یہ زخم صرف تمھارے کلیجے میں ہی نہیں تمام کشمیر کے کلیجے میں لگانا چاہتا ہے ۔ ایسا زخم جو صدیوں تک رستا رہے ۔ جب یہ بھر جائے گا تو تمھاری اِن اغوا کی ہوئی عورتوں کے بچے اس کو تازہ کرنے کے لئے یہاں پہونچیں گے ۔ (اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر) کہاں ہے دوسرے جوان؟ ابھی تک نہیں آئے؟

پہلا پٹھان ۔ وہ آج حرام زادے مقبول کے پیچھے لگے ہوتے ہیں ۔ اُسے لے کر ہی آئیں گے آج تو ۔

سردار ۔ بہت خوب پھر ہم کاٹھو کو چھوڑ دے گا ۔ اس کے رسوں سے مقبول کو جکڑا جائے گا (قہقہہ لگاتا ہے) کہو کشمیر مردہ باد ۔

عنایت اللہ ۔ کشمیر مردہ باد ۔

سردار ۔ لاؤ اس کی عورت کو اب یہاں ۔ اُسے بتاؤ اس کا بزدل خاوند کشمیر مردہ باد کہہ رہا ہے اور وہ ابھی تک اپنی ضد پر اڑی

ہے۔ (عنایت سے مخاطب ہو کر) جب تم کشمیر مردہ باد کہتے ہو تو ہمارے سپاہیوں کے زخم بھرنے لگ جاتے ہیں۔

(لٹیروں کا ایک گروہ ڈھول بجاتے ہوئے مکان میں داخل ہوتا ہے۔ مقبول شیروانی کو رسوں سے جکڑ کر اندر دھکیلتے ہیں ——— آزاد کشمیر زندہ باد کے نعروں کی آواز)

دوسرا پٹھان - لو سردار آج ہم تمہاری خاطر بہت بڑا شکار لایا ہے۔

سردار - پیش کرو۔

دوسرا پٹھان - (مقبول کو دھکا دے کر) جھک جاؤ سردار کے قدموں میں۔

مقبول - (سنبھلتے ہوئے) نہیں

پہلا پٹھان - (زور سے طمانچہ لگا کر) کیا کہا نہیں جھکے گا۔

سردار - کس طرح ہاتھ لگا تمہارے یہ کافر ؟ کئی دنوں سے جاسوسی کر رہا تھا۔

دوسرا پٹھان - بزدل خود کچھ نہیں کر سکے تو عورتوں اور بچوں کو آگے دھکیل دیا ہے۔

سردار - عورتوں اور بچوں کے خون کے ذمہ دار یہی غدار ہیں۔ ورنہ یہ عورتیں، کشمیر کی یہ پریاں، کابل اور غزنی کے بازاروں میں بکتیں یہاں بے رحمی سے قتل نہ ہوتیں۔

مقبول - (چیخ کر) بکومت

ایک آواز - اڑا دو سر اس گستاخ کا۔

دوسری آواز - مار دو گولی سالا کو۔

سردار - (بلند آواز سے) نہیں اسے اس طرح نہیں مارا جائے گا۔

اُس کے جسم کا ایک ایک حصہ کاٹا جائے گا اور ہر وار پر اسے کشمیر مردہ باد کہنے کو کہا جائے گا۔ اس کی آنکھیں نکیلے بھالوں سے نکالی جائیں گی، اس کی ناک خنجر سے کاٹی جائے گی، اس کے کان اسی کے چاقو سے اڑائے جائیں گے اور سب سے آخر میں اس کی زبان کھینچی جائے گی۔

(آنگن میں عورتوں کے چیخنے کی آواز ابھرتی ہے)

سردار - (غصے سے) ان سب کو خاموش کر دو اور جو چیخنے اور رونے کی کوشش کرے اس کا سب کے سامنے منہ کالا کرو۔ اور پھر اس کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالو۔ (نرمی سے) ہاں تو کس طرح پکڑا اس کتے کو تم نے ؟

دوسرا پٹھان - کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ شامل ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور مٹھی بھر سپاہی ہوائی جہازوں سے سرینگر میں اترے ہیں۔ یہ لوگ اس خبر کو گھر گھر پہنچا رہے ہیں اور سب کو کہہ رہے ہیں کہ اب ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اب ان کی مدد کو بہت بڑی فوج آگئی ہے۔

سردار - (جوش سے) اچھا یہ بات ہے تو آج رات تک ہی تمام قصبے میں قتل عام شروع کر دو۔ تمام مکانوں کو پھونک دو۔ گھروں کو لوٹ لو، مردوں کو گولی سے اڑا دو، عورتوں کی بے عزتی کرو اور اُن کے بچوں کو اُن کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ تا کہ صبح جب ہندوستانی فوج آئے تو وہ آگ کے شعلوں سے جھلسے اور کشمیریوں کے خون سے اپنے کپڑے داغدار کرے۔

دوسرا پٹھان - معصوم بچوں سے جاسوسی کراتے ہیں کمینے۔ جنگل میں آج کئی بچے گولی سے اڑائے گئے ہیں۔ کشمیر کا مرد، ہر عورت اور

ہر بچہ غدار ہے۔ ان میں سے کسی پر اعتبار نہ کرو۔ بلا تفریق مذہب یہ سب قتل کئے جانے کے قابل ہیں۔

پہلا پٹھان۔ تو کیوں کانپتا ہے اے کاکو؟

سردار۔ ہاں اسے کھول دو۔ اب اس کی جگہ لینے کو آگیا ہے ایک اور ذلیل کتا۔ باہر آجاؤ کاکو، تو بھی لے لے اپنا بدلہ۔ اسی سے تمہاری دشمنی تھی نا، تھوک دے اس کے منہ پر۔ حرامی ڈرتا کیوں ہے، اس کے ہاتھ پیر تو بندھے ہوئے ہیں۔ آخر کشمیری ہے نا گیدڑ کا بچہ!

مقبول۔ (انتہائی جوش سے) خاموش۔ اگر میرے ہاتھ پیر نہ بندھے ہوتے

دوسرا پٹھان (بات کاٹ کر) تو تو سردار کو قتل کر دیتا۔ یہ لے (سنگین اس کی پیٹھ میں گھونپنے کی کوشش کرتا ہے) (عورتیں آہستہ سے چیختی ہیں، ہائے چھرا مار دیا ظالموں نے، وہ دیکھو اس کی قمیص خون سے بھر رہی ہے)

سردار۔ یہ کیا کر دیا تم نے۔ دیکھنا اسے کہیں گہرا زخم تو نہیں لگا۔

پہلا پٹھان۔ حضور کو اس سے ہمدردی کیوں ہونے لگی؟۔

دوسرا پٹھان۔ اسے تو زندہ جلا دینا چاہئے۔

سردار۔ واقعی یہ اس سزا کا حقدار ہے لیکن مرنے سے زیادہ مفید یہ ہمیں زندہ رہ کر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم اس کے دوسرے ساتھیوں کے متعلق پوچھیں گے اور ان سب کو مار دینے کے بعد اگر یہ چاہے گا تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ (مقبول سے مخاطب ہو کر) کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟۔

مقبول۔ میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

سردار۔ تم مسلمان ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہو؟

مقبول۔ میں مسلمانوں کے خلاف نہیں لٹیروں کے خلاف لڑتا ہوں۔ لٹیرے جن کا مذہب ظلم ہے۔ جن کی خونخوار آنکھیں ایک ہندو اور مسلمان میں امتیاز کرنے کی عادی نہیں۔ جن کا نصب العین معصوموں کو قتل کرنا۔ اور بستے شہروں کو برباد کرنا ہے۔ جو اسلام کے سنہری اصولوں کی توہین کرتے ہیں۔

سردار (تحکمانہ انداز سے) اس کے ننگے جسم پر کوڑے لگاؤ۔

(مقبول کے جسم پر کوڑے لگاتے جاتے ہیں)

سردار۔ ہاں اب چھوڑ دو اور بتاؤ تمہیں یہ کہاں اور کس طرح ملا؟

دوسرا پٹھان۔ یہاں سے تقریباً ایک میل دور جنگل میں تین چار بچوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ رات کو یہ شہر کے قریب ہی کہیں گھومتا رہا تھا۔ ہم صبح سے اس کی کھوج میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ اس کی نظر شاید ہم پر پڑ گئی۔ یہ بچوں سمیت بھاگ پڑا اور ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ جب ہم درخت کے نیچے کھڑے ہوتے تو اس نے پستول سے فائر کرنا شروع کر دیا۔

سردار۔ اتنی ہمت

دوسرا پٹھان۔ وہ دیکھئے نا رفیق کے بازو پر گولی کا زخم۔

سردار۔ ہوں۔

دوسرا پٹھان۔ جی میں تو آیا کہ اسے گولی سے اڑا دیں مگر پھر زندہ

ہی پکڑ لائے۔ شیر کو مارنے کی بجائے زندہ پکڑنا زیادہ بہادری کا کام ہے۔

سردار۔ کہاں ہے اس کا پستول ؟

دوسرا پٹھان۔ یہ رہا۔ (پستول جیب سے نکال کر دیتا ہے)

سردار۔ اچھا اسے گولی سے اڑاتے وقت پہلی گولی اسی کے پستول سے ماری جائے گی۔

پہلا پٹھان۔ بہت اچھا حضور

سردار۔ (مقبول سے) تمھارے ساتھ اور کون تھا اس جنگل میں ؟

مقبول۔ اور کوئی نہیں تھا۔

سردار (کڑک کر) اُسے اور کوڑے لگاؤ۔ اُدھیڑ دو اس کی چمڑی

(پھر کوڑے لگانے کی آواز۔ اس بار مقبول آہستہ آہستہ کراہنے لگتا ہے)

سردار۔ شاباش ایسے ہی۔ اور دیکھو جوانو تم تیار ہو جاؤ۔ بکرے بھونے گئے ہیں۔ کھانا کھا لو اور پھر اس کمینے غدار کو قصبے کی گلیوں میں گھسیٹتے ہوئے چوک میں لے چلو وہاں اِسے گولی سے اُڑایا جائیگا

(ملی جلی آوازوں کا شور۔ کوڑوں کی آواز اور عورتوں کی کھسر پھسر سب مل کر ایک بھیانک سماں پیدا کر رہے ہیں)

چوک کے قریب وہی دو منزلہ مکان ——

رکمنی۔ (آہ بھر کر) کتنا ظلم کیا ہے ظالموں نے۔ ساری گلیاں مردوں سے بھری پڑی ہیں۔

سیوا سنگھ :۔ خوب تباہی کی ہے رات کو لٹیروں نے۔ وہ کون تڑپ

رُکمنی۔ کدھر

سیوا سنگھ۔ (اشارہ کرتے ہوتے) گلی کے نکڑ پر نالی کے کنارے۔

رُکمنی۔ (خوف اور غم سے بھرا لہجہ) یہ رمضاناں تو نہیں ؟

سیوا سنگھ۔ ٹھہرو میں دیکھ آتا ہوں۔

رُکمنی۔ اب نیچے گلی میں جاؤ گے ؟

سیوا سنگھ۔ ہاں

رُکمنی۔ مگر.....

(سیوا سنگھ کچھ نہیں سنتا فوراً نیچے چلا جاتا ہے اور گھائل کو اٹھا کر لاتا ہے)

سیوا سنگھ۔ مارا گیا بچارہ !

رُکمنی۔ رمضاناں۔ (خاموشی)

سیوا سنگھ۔ ابھی اس میں زندگی کے آثار ہیں۔ ذرا پانی ٹپکاؤ اس کے منہ میں

رُکمنی۔ (پانی ٹپکاتے ہوتے) رمضاناں

رمضاناں۔ (دبی ہوئی سی آواز میں) ہاں بہن۔

رُکمنی۔ کیا ہوا یہ ؟

رمضاناں۔ گولی لگی —— گوروارہ جل گیا ہے۔ (اُف) پانی۔

رُکمنی۔ (اس کا سر گود میں لے کر کے منہ میں پانی ٹپکاتے ہوتے) رمضاناں؟

(خاموشی)

سیوا سنگھ۔ وہ تو ختم ہو گیا

رُکمنی۔ ختم کر گیا زندگی کا کھیل اور زندہ کر گیا اپنا نام۔

رُکمنی ۔ (تشویش سے) مقبول ابھی تک نہیں لوٹا ۔

سیوا سنگھ ۔ جانے کیا ہوا اس کا؟

رُکمنی ۔ رات بھر یہاں رہ کر کچھ لوگ صبح اپنے گھروں میں واپس چلے گئے ہیں ۔ اُن کا کیا ہوگا؟

سیوا سنگھ ۔ جب تک وہ ہماری حفاظت میں تھے ۔ اپنی جان دے کر انھیں بچانا ہمارا فرض تھا ۔ اب وہ اپنی ذمہ داری پر گئے ہیں، یہ حریص لوگ ذلت ہیں قوم کے لئے ۔ انھیں اپنی زندگیوں کی نسبت سونا زیادہ عزیز ہے ۔

رُکمنی ۔ (پُرمعنی انداز میں) کب تک پہنچے گی ہندوستانی فوج؟

سیوا سنگھ ۔ آج شام تک پہنچ جائے گی ۔ اگر دوپہر تک مقبول واپس نہ آیا تو پھر میں سری نگر جاؤں گا ۔

رُکمنی ۔ نہیں اب تو میں نہ جانے دوں گی ۔ میرا کیا بنے گا بعد میں؟

سیوا سنگھ ۔ اپنی عزت کی حفاظت اب تمھیں خود کرنا ہوگی ۔ دشمن کا مقابلہ کرنا اور جب مقابلہ ناممکن ہوجائے تو پستول کی آخری گولی اپنے دل پر چلا لینا ۔

(ڈھول کی اونچی آواز اور نعروں کا شور)

رُکمنی ۔ آج تو دن میں بھی ڈھول کی آواز آرہی ہے کوئی نیا ظلم ڈھانے والے ہیں شاید ۔

سیوا سنگھ ۔ آواز تو کہیں قریب سے ہی آرہی ہے ۔

رُکمنی ۔ (چھت پر چڑھ کر) لٹیرے گلیوں میں سے بھاگ بھاگ کر بازار میں جمع ہو رہے ہیں اور اسی طرف بڑھ رہے ہیں ۔

سیوا سنگھ ۔ شاید کسی نے انھیں ہمارے مکان کی خبر دے دی ہے ۔ تم نیچے اُتر آؤ

(رکمنی نیچے چلی آتی ہے)

رکمنی ۔ وہ تو گولیاں بھی چلانے لگے ہیں ۔

سیوا سنگھ ۔ ان سب لوگوں سے کہدو کہ اب وقت نزدیک آگیا ہے انھیں مرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے ۔ (سب سے مخاطب ہوکر) دیکھو بہنو اور ماتاؤ تم میں سے کوئی بھی زندہ لٹیروں کے ہاتھ نہ آئے ۔ تم سب کے پاس اپنے آپ کو قتل کرنے کا سامان موجود ہے ۔

ایک آواز ۔ ہاں ۔ اب وقت آگیا ہے ۔

دوسری آواز ۔ ہم تیار ہیں ۔

تیسری آواز ۔ (جوان لڑکیاں سب ایک طرف ہوجائیں) ۔

(آزاد کشمیر زندہ باد کے نعروں کی گونج)

رُکمنی ۔ (خوفزدہ ہوکر) ہیں! وہ تو کسی کو گھسیٹ رہے ہیں ۔

سیوا سنگھ ۔ کتنی بے دردی سے گھسیٹ رہے ہیں غریب کو ۔

رکمنی ۔ وہ ضرور کوئی بڑا کارکن ہوگا جسے اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے

سیوا سنگھ ۔ مجھے تو مقبول ہی کی فکر ہے ۔

رُکمنی ۔ واہگورو بچائے اس کو ۔

سیوا سنگھ (جھنجھلا کر) واہگورو جو خود اپنے گوردوارے اور اس میں پناہ لئے ہوئے سینکڑوں انسانوں کو نہ بچا سکا ۔ مقبول کو کیا بچائے گا ۔ مقبول کو بچائے گا اس کا چٹان کی طرح مضبوط جذبہ ۔

رُکمنی ۔ (کلیجہ تھام کر) وہ تو مقبول ہی ہے)

سیوا سنگھ ۔ (وقفہ کے بعد) ہاں پھنس گیا آخر بھیڑیوں کے نرغے میں
(ایک آہ بھرتا ہے)

رُکمنی ۔ دیکھو کتنے خوش ہیں وہ جیسے مقبول کے ہاتھ آ جانے سے سارا کشمیر
ان کے ہاتھ آ گیا ہو ۔

سیوا سنگھ ۔ اب تو کشمیر کا ہر بچہ مقبول بن چکا ہے ۔

رُکمنی ۔ کس بیدردی سے جکڑ رکھا ہے بچارے کو قصائی کہیں کے ۔

سیوا سنگھ ۔ اس کی قمیص تو خون سے تر ہے شاید گولی لگی ہے کہیں
(جلوس رُک جاتا ہے اور ڈھول کی آواز بند ہو جاتی ہے)

سردار (اونچی آواز سے) ساتھیو تمھارے سامنے بارہ مولہ کا وہ لیڈر
ہے ۔ جو بزدلوں کی طرح چھپ چھپ کر ہماری جاسوسی کرتا رہا ہے ۔
آج اتنے دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے جنگل سے پکڑا گیا ہے ۔
بتاؤ اِسے کیا سزا دی جائے ۔

ہجوم کی آواز ۔ اُسے گولی سے اُڑا دو ۔

سردار ۔ نہیں ابھی نہیں ۔ اِسے ایک بار پھر موقع دیا جائے گا ۔
(مقبول سے مخاطب ہو کر) موت کے منہ میں کھڑے کشمیری کہو ۔
نیشنل کانفرنس مردہ باد ، کشمیر مردہ باد ۔

مقبول (باوجود نقاہت کے چیخ کر) نیشنل کانفرنس زندہ باد ، کشمیر
زندہ باد ۔۔

رُکمنی ۔ اتنی ہمت ۔ اس نے تھوک دیا ہے پٹھان کے منہ پر ۔

سیوا سنگھ (آہستہ سے) ہاں چپ رہ ؟

سردار ۔ رفیق آگے بڑھ کر چھُرے سے اس کی ناک کاٹ ڈالو اور
اسے پاؤں تلے مسل دو ۔

پہلا پٹھان ۔ (آگے بڑھ کر) بہت اچھا حضور ۔

رُکمنی ۔ (چیخ کر) ظالم نے اس کی ناک کاٹ ڈالی ۔ دیکھو خون کس
طرح بہ رہا ہے ۔ اور وہ رسوں سے جکڑا ہوا کس طرح تڑپ
رہا ہے ۔

سیوا سنگھ ۔ کہاں ہے میری بندوق ؟ میں اِس پاپی کا نشانہ کرونگا ۔

رُکمنی ۔ نہیں رہنے دو ۔ وہ اس وقت بپھرے ہوئے ہیں ۔

سیوا سنگھ ۔ (کمرے والی عورتوں سے) میرا فرض مجھے بلا رہا ہے ۔
تمہیں اپنا فرض پورا کرنا ہوگا ۔ تم میں سے اگر ایک بھی عورت
زندہ لٹیروں کے ہاتھ آئی تو میری اور مقبول کی روح کو کبھی
چین نہ ملے گا ۔ ہم جہنم کے شعلوں میں تڑپتے رہیں گے ۔

ایک آواز ۔ پہلے مجھے قتل کر جا ۔

دوسری آواز ۔ خاموش رہ بڑھیا ۔

تیسری آواز ۔ نوجوان لڑکیو، تم مرنے کے لئے بالکل تیار ہو جاؤ

سیوا سنگھ ۔ رکمنی بندوق میں کارتوس بھرے ہیں نا ۔ اگر تم موت
سے ڈرتی ہو تو یہ گولی جو میں اس لٹیرے کو مارنا چاہتا ہوں
تمھارے سینے پر چلاؤں ۔ لیکن اس گولی سے تمہیں مارنا میری ہی
نہیں تمام ملک کی بے عزتی ہے ۔ تم آزادی کی خاطر لڑنے
والے ایک سپاہی کی بیوی ہو ۔

رُکمنی ۔ اب میں خود مرجاؤں گی پتی دیو ۔

سیوا سنگھ۔ تو میں چلا۔

(گولی کی آواز)

(شور۔ پکڑو، پکڑو، وہ بھاگا اس گلی میں، دوڑو گولیوں کی اور آوازیں)

رکمنی۔ وہ گرا کشمیر کی ناک کاٹنے والا (اپنی عورتوں سے مخاطب ہو کر) لٹیرے اب ادھر ہی بڑھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے بچوں کو قتل کرنا شروع کردو۔ ہاں ایسے ہی۔ شیلا، گور بخش، مادھوری، کملا سب اپنے خون سے کشمیر کے ماتھے پر ٹیکہ لگاؤ۔ (جوش سے) تمہارے ہاتھوں میں لغزش کیوں آ رہی ہے۔ کیوں کانپ رہی ہے تلوار تمہارے ہاتھ میں گور بخش؟ اڑا دو سر چار پانچ کا۔

(وقفہ)

شاباش۔ ڈاکو پہنچ گئے ہیں ڈیوڑھی تک۔ میں اس وقت اپنے سینے میں گولی ماروں گی جب یہاں ایک بھی عورت اور بچہ زندہ نہ ہوگا۔

(چیخوں کی آوازیں گونجتی ہیں، بچوں کے بلکنے کا شور ابھرتا ہے اور گولی چلتی ہے)

مقبول زندہ باد، کشمیر زندہ باد۔ وہ گرا ڈیوڑھی تک پہنچنے والا پہلا آدمی۔ (گولی کی آواز) کشمیر زندہ باد۔

(رکمنی لڑکھڑا کر گر جاتی ہے)

سردار۔ (غضبناک ہو کر) کون تھی وہ عورت جو گولیاں چلا رہی تھی۔ آگ لگا دو اس مکان میں۔ اور اس سے پہلے تمام عورتوں کو باہر گھسیٹ لاؤ اور انھیں سر بازار ننگا کردو۔

پہلا پٹھان۔ اس میں ایک بھی عورت زندہ نہیں۔ کمروں میں صرف خون

ہی خون ہے۔

دوسرا پٹھان۔ مقبول کو جکڑ دیا ہے کھمبے کے ساتھ۔

سردار۔ کہاں ہے وہ پستول!

پہلا پٹھان۔ لیجئے۔

(گولی کی آواز)

سردار۔ کہو کشمیر مردہ باد۔ تم اب بھی چھوڑ دئے جاؤ گے۔ تمھارے زخم بھر سکتے ہیں وہ ابھی اتنے گہرے نہیں۔

مقبول۔ (آواز میں کمزوری اور زخموں کے درد کا امتزاج ہے) کشمیر زندہ باد ظالم مردہ باد۔

سردار۔ (گرج کر) چلا دو گولی اس ذلیل کتے پر۔ اس کے جسم کا ایک ایک اعضا اڑا دو۔

(گولیوں کی آوازیں جن میں کبھی کبھی کشمیر زندہ باد کا نعرا ابھرے)

جگ ہنسائی

تھوڑی ہی دیر پہلے مجھے کشمیر میں اپنے کچھ عزیزوں کی موت کی خبر ملی تھی۔ لکھا تھا کہ انھیں نہایت بے دردی سے مارا گیا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ بربریت کا وہ دور جس نے کچھ ہی دنوں پہلے انسانیت کو پیا، نچوڑا اور اس کے خون کو قطرہ قطرہ کر کے جلتی ہوئی ریت پر ڈالتا ہوا تیزی سے گذر گیا ایک بار پھر پلٹ آیا ہے۔ انسانیت کا ایک انگ جو بچ گیا تھا اور دوسرے انگوں سے جدا کر دیئے جانے کے بعد درد اور تکلیف سے تڑپ رہا تھا اُسے بھی شکنجے میں کس دیا گیا ہے اور ہڈیاں چٹخ رہی، خون بہ رہا ہے اور اجسام جھلس رہے ہیں —— درندوں کی بھوکی آنکھوں اور خون بھرے ہاتھوں سے ڈر کر صرف میری ہمشیرہ نے بیسیوں دوسری عورتوں کے ساتھ کوئیں میں چھلانگ نہیں لگائی بلکہ کل نسائیت نے اپنے آپ کو بے بس و مجبور دیکھ کر موت کا سہارا مانگا ہے۔ میری بہن نے ہی نہیں دنیا کی کل عورتوں نے اپنی عصمت کی رکھشا کی ہے۔ ہندوستان کی دبی ہوئی سسکتی ہوئی، کراہتی ہوئی نیم جاں نسائیت اتنے گہرے کنوئیں میں گر کر زندہ رہ سکے گی؟ اور کیا باہر کھینچ جانے تک وہ گوشت اور ہڈیوں کی ایک لوتھ نہ بن چکی

ہوگی؟ اور اگر اُسے باہر کھینچنے میں کچھ وقت لگا تو پھر —— تو پھر وہاں صرف سڑاند اور تعفن کی لپٹیں رہ جائیں گی۔ پدمنی، دمینتی اور ساوتری کے ناموں سے نکلتی ہوئی عصمت اور پاکیزگی کی دھیمی دھیمی مدھر باس نہیں۔

غم اور غصے کے ملے جلے اثر سے ذہن کو بچانے کے لئے میں نے ریڈیو کا سوئچ گھمایا اور جیسے ایک تیز سا بھالا کسی نے میرے کلیجے کے پار کر دیا۔

"ہم بہت شوک سے یہ خبر دیتے ہیں کہ آج شام پانچ بجنے کے کچھ ہی منٹ بعد مہاتما گاندھی کا سورگ واس ہو گیا" —— اور پھر ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ جیسے کوئی آدمی چھرا گھونپ کر کچھ لمحے مقتول کی تڑپن دیکھ رہا تھا اور مقتول کی نگاہیں اس کے چھرے پر جمی تھیں جو جسم کے کسی اور حصے کو چھیدنے والا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر اُسی بھیانک خبر کو دہرایا گیا، چھرا ایک بار پھر گھونپا گیا، لہو کی دھار ایک بار پھر چھوٹی —— کتنی ہی دیر اس طرح ہوتا رہا۔

تمام عمر جس نے شانتی، اہنسا، اور سچائی کا جھنڈا آکاش تک اوپر اٹھایا۔ جس نے بھوکے اور ننگے ہندوستان کی نمائندگی خود بھوکا اور ننگا رہ کر کی، خود پتھروں کی چوٹیں سہ کر دوسروں پر پھول برسائے۔ جس نے تعصب کے شعلے اگلتی ہوئی آنکھوں میں اپنی گمبھیر اور شانت آنکھوں کی خنکی بھری آج دنیا سے اس کا وجود ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی کتنی معصومیت اور پونترتا تھی اس چہرے پر! میں نے جب بھی اُسے دیکھا اس میں ایک نیا جلال ایک نئی تازگی، ایک نیا نور بسا ہوا پایا۔ صرف میں نے ہی نہیں بلکہ سسکتی اور کراہتی ہوئی انسانیت نے بھی جب اس کی طرف دیکھا اسے ایک غیر مبہم سکون کا احساس ہوا۔ اس کا متزلزل یقین پھر اُبھرا، اس

بات کا یقین کہ اس پر کئے گئے سینکڑوں واروں کے زخموں کا مرہم بھی موجود ہے۔ اگر اُسے تازہ زخم دیئے جا رہے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ساتھ پچھلے زخم بھر بھی رہے ہیں۔ انسانیت کی زخمی اور جاں بلب دیوی اب کدھر جائے گی، کس کو مدد کے لئے پکارے گی اور آخر کب تک موت کے بے درد واروں کا مقابلہ کرے گی؟

اور جب ریڈیو پر پھر ایک جانی پہچانی لیکن غم اور درد سے بھری ہوئی آواز نے ملک کے دکھی لوگوں کو مخاطب کیا تو میری خشک آنکھیں بھی اُبل پڑیں۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا ان لمحوں میں جب مجھے سوچنے کے لئے اور کچھ نہ ملتا تھا۔ جب میرے دل میں ایک عجیب قسم کی تلخی ہوتی تھی۔ کہ میں رو کیوں نہیں سکتا؟ کیا حادثات کی جھلس دینے والی لو نے میری آنکھوں کے سوتوں کو بالکل سکھا دیا تھا، ضرورت کے وقت کیا مجھے ان میں سے دو بوندیں بھی نہ مل سکیں گی، کیا میں نے رو رو کر یہ سارا خزانہ ختم کر ڈالا تھا؟ مجھے کیوں کسی کی موت پر رونا نہیں آتا؟ میں کسی کے دکھ میں شریک ہو سکتا ہوں لیکن خشک آنکھوں سے اور بغیر آنسو بہائے دکھ اور تکلیف میں کسی کا ساتھ دینا تو ایک فضول اور بے معنی سی بات ہے اور میں اکثر سوچتا کل اگر میرا کوئی نہایت عزیز اور قریبی انسان مر جائے اور میں اس کے مردہ جسم پر دو آنسو — نہ بہا سکوں، میں اس کی گرم راکھ پر جلتے ہوئے دو اشک نہ ڈال سکوں، تو لوگ کیا کہیں گے، دنیا کیا سمجھے گی؟ روح تک کو پگھلا دینے والے اس غم کا احساس کیسے ہوگا جو میرے اندر سلگے گا، جلے گا۔ اور مجھے اندر ہی اندر جھلسے گا۔ دنیا کو تو آنسو چاہئیں پانی کی گرم گرم نمکین بوندیں ——— اور پنڈت نہرو نے جب کہا کہ

اُسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا تو میری روح کو جیسے اس نے مسل ڈالا اور میں بے اختیار رو پڑا۔ وہ آنسو جو کچھ ہی لمحے پہلے اپنی ہمشیرہ اور دوسرے رشتہ داروں کی موت پر نہ نکلے تھے یوں اُمڈے جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ میرے آنسو بہتے رہے اور ریڈیو پر نہرو اور سردار کی ماتمی تقریریں نشر ہوتی رہیں۔

پچیس سال تک لڑنے والا مجاہد۔ زخم پر زخم کھاتا رہا، دکھ پر دکھ جھیلتا رہا اور تھکے ہوئے اور شکستہ پیروں سے اندھیرے کی گھنی تہوں میں آگے بڑھتا رہا اور اس کے پیچھے رضاکاروں کا ایک گروہ چلتا گیا۔ اس کے دماغ میں جیسے سیاست کی شطرنج کا نقشہ بچھا تھا اور وہ مہروں کو ادھر سے اُدھر پٹک رہا تھا کیا اجنبی حکومت کے کرتا دھرتا اس کے خلاف نہ تھے؟ جہاں تک اُن کی سامراجی حکومت کا تعلق تھا گاندھی اس پر کڑی سے کڑی چوٹ لگانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اُسے ایک بار نہیں کئی بار جیل میں ڈالا گیا۔ کیا وہ اس خطرناک بوڑھے کو ختم نہ کر سکتے تھے، کر سکتے تھے لیکن وہ اس سماجی، اخلاقی اور حیوانی جرم کا ارتکاب کرنا نہ چاہتے تھے آزاد لوگ جانتے تھے کہ آزادی کی خاطر لڑنے والے اس مجاہد کی موت اُن کے لئے ایک بھیانک زلزلے کا موجب بن جائے گی۔ اور جب ہندوستان آزاد ہو گیا، جب 'ہندوستان چھوڑو' کی تحریک کامیاب طور پر ختم ہو گئی، جب راجدھانی کی اونچی سے اونچی عمارت پر ترنگا لہرایا، جب دنیا کے کونے کونے سے مبارک اور فتح کی آوازیں گونجیں تو ایک ہندوستانی نے آگے بڑھ کر اس ہنستے، پرنام کرتے ہوئے دیوتا کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اپنے ہی ماتھے پر نہیں تمام بھارت کے ماتھے پر کلنک کا

ٹیکا لگایا جسے آنے والی صدیوں کا تیز دھارا بھی نہ دھندلا سکے گا، تواریخ کے صفحوں پر لگا ہوا یہ خونی داغ ابد تک اُجلا رہے گا۔ دوسرے ملکوں میں بسنے والے لوگ کہیں گے ہندوستانیوں نے دنیا کے سب سے بڑے انسان کو جو بدقسمتی سے اُن کے ملک میں پیدا ہوا تھا اور عمر بھر اُن کی غلامی کی کڑیوں کو توڑتا رہا تھا عین اس وقت جب آخری کڑی ٹوٹی ایک مجرم کی موت مار ڈالا۔ عین اس وقت جب دنیا کے تمام ممالک یہ سوچ رہے تھے کہ مادہ پرستی، جنگ اور آپسی تلخی کے اس دور میں انسانیت کو بچانے والے اس انسان کو نوبل پرائیز دیا جائے اور دنیا پر یہ واضح کیا جائے کہ سچائی۔ اہنسا اور شانتی کا یہ جھنڈا صرف ہندوستان پر ہی نہیں تمام دنیا پر لہرائے گا، گاندھی کے اپنے ہی ایک ہم وطن نے اُسے گولی سے مار ڈالا۔ یہ انعام تھا جو اُسے اپنی تمام قربانیوں کے عوض دیا گیا' یہ صلہ تھا جو دنیا کے ایک بڑے انسان کو ملا۔ اور مجھے اس وقت ابراہیم لنکن کی موت یاد آگئی۔ اُسے بھی جشن آزادی میں ملک کو مدّت کی غلامی سے چھڑانے کا یہی معاوضہ دیا گیا تھا۔

میرا سر شرم اور دُکھ سے جھک گیا اور میں نے محسوس کیا کہ کوئی بھی ہندوستانی کچھ عرصہ کے لئے زمین سے نظریں نہ اٹھا سکے گا۔ اب وہ اس ترنگے کی طرف نہ دیکھ سکے گا جو راجدھانی کی شاہی عمارتوں پر لہرا رہا ہے۔ اب اس میں اشوک کے چکر کی جگہ اُسے انسانیت کا خون آلود کلیجہ نظر آئے گا۔ اور ہمالہ کی چوٹیوں پر بیٹھے ہوئے دیوتا اُسے دھتکار دیں گے۔

ریڈیو میں برنارڈ شا کا مختصر لیکن تڑپا دینے والا بیان نشر ہوا

کہ گاندھی کی موت سے پتہ چلتا ہے کہ حد سے زیادہ نیک ہونا کتنا بھیانک ہے —" ادیب کی نظروں نے کن گہرائیوں کو ماپا تھا۔ اور پھر ریڈیو نے سیکورٹی کونسل کے ایک ہندوستانی نمایندہ آئنگر سوامی کا بیان نشر کیا۔ "ہم یہاں ساز بجا رہے ہیں اور کشمیر جل رہا ہے" — اور میرے ذہن میں اس بیان کے کچھ الفاظ ابھرنے لگے جو کچھ ہی ہفتے پہلے میں نے کشمیر کے متعلق دیا تھا۔

"چند روز سے اخبارات میں پڑھ رہا ہوں کہ کشمیر کی ساکن فضا میں بھی ایک طوفان جاگ اٹھا ہے۔ ہر طرف پھیلے ہوئے دلکش جمود نے ایک بھیانک انگڑائی لی ہے۔ جب میں نے پڑھا کہ بلوائیوں نے وادئ کشمیر پر حملہ کر دیا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نانتیوں کے کسی گروہ نے ایجنٹا کے غاروں میں گھس کر اُن تصویروں کو بگاڑنا شروع کر دیا ہو جو قیمتی امانت کے طور پر وقت اور تاریخ کے حوالے تھیں، یا یوں محسوس ہوا کہ شاہجہاں کی آنکھ سے نکلے ہوئے منجمد آنسو کو کسی نے ہتھوڑے کی چوٹ سے توڑ دیا تھا۔ ایک خواب فضا میں بکھر کر سسک رہا تھا، ایک نغمے کی آخری گونجیں لرز لرز کر کراہ رہی تھیں — آرٹ، حسن اور معصومیت گرجن کی برف آلود چوٹیوں پر کھڑے تاروں کو تک رہے ہیں؛ ازلی شمعوں کو جو اس اندھیرے میں شاید اُن کی کچھ مدد کر سکیں۔

تخریب کی بھڑکی ہوئی آگ کے شعلے آخر یخ بستہ ہواؤں سے ٹکرا گئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ہواؤں کے سرد اور تند تھپیڑے ان شعلوں کو نگل جائیں گے، اُبھرتے ہوئے وقتی طوفان کی لہریں آخر سکون

کی گہرائیوں میں گم ہو جائیں گی، اجنتا کے غاروں کو پھوڑنے والے ہاتھ شل ہو جائیں گے اور شاہجہاں کے نقرئی خواب کو توڑنے والا ہتھوڑا آخر ٹوٹ جائے گا۔

میں اپنے وطن سے دور تڑپ رہا ہوں، وطن سے دور ہر انسان اپنی ماتری بھومی پر توڑے جاتے ہوئے مظالم کو دیکھ کر یوں ہی تڑپتا ہے شیخ عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کی خدمت میں میری گذارش ہے کہ وہ اپنے وطن کے لئے خون کا آخری قطرہ بہا دیں۔ دنیا پر روشن ہو جائے کہ آرٹ، حسن اور نغمہ کے شیدائی اپنی آبرو بچانے کے لئے خون بھی بہا سکتے ہیں —— یہ ہے میری مانگ ریاست کے تمام فن کاروں سے

(زندہ باد مہاراجہ بہادر۔ زندہ باد شیر کشمیر)

مرنے سے پہلے میری ہمشیرہ نے بھی یہ بیان پڑھا ہوگا۔ اُس نے دوسروں کو بھی پڑھایا ہوگا۔ یہ اس کے بھائی کا بیان تھا جس کے خون کے ہر قطرے میں کشمیر کے حسن، آرٹ اور معصومیت کے عکس تیرتے تھے۔ اس نے اپنے آپ میں مقابلے کی ایک نئی طاقت محسوس کی ہو گی۔ اس کی ٹوٹتی ہوئی ہمت بندھ گئی ہو گی اور شاید اس طاقت اور ہمت کے سہارے اس نے کوئیں میں چھلانگ لگائی تھی —— اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ کشمیر جل رہا ہے اور اس میں میری ہمشیرہ جل رہی ہے، کئی اور عورتیں جل رہی ہیں، کل انسانیت جل رہی ہے اور کشمیر کے حسن آرٹ اور معصومیت گرجن کی چوٹیوں پر کھڑے تاروں کو ٹک ٹک کر تراشش ہو رہے ہیں۔

انسانیت اور سچائی کا علمبردار جمنا کے کنارے جلتا ہوگا۔
بھوکے اور ننگے ہندوستان کی نمایندگی ختم ہو جائے گی۔
کشمیر کی وادی چیخوں اور سسکیوں سے گونجے گی
لال قلعہ کی برجی پر لہراتا ترنگا کسی سوچ میں غرق ہوگا۔
اور ہمالہ کی چوٹیوں پر بستے دیوتا ہمیں دھتکارتے ہوں گے۔

———◆✕◆———

فرض

کردار —

(۱) اقبال

(۲) سرلیش

(۳) کنور

(۴) کلا

نظارہ —

ایک عالیشان مکان کا ڈرائنگ روم۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر ریشمی پردے لٹک رہے ہیں شمالی دیوار کے ساتھ صوفہ سیٹ لگا ہے اور اُس کے سامنے ایک تپائی رکھی ہے۔ تپائی پر تازہ اخبار، سگریٹ کا ڈبہ اور ایش ٹرے پڑی ہے؟ اقبال اور سرلیش صوفے میں بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اُن کے چہروں پر پریشانی کے آثار ہیں۔

اقبال - اب تو حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ لٹیروں نے ریاست کے کئی حصوں میں تو خوب لوٹ مار شروع کر دی ہے۔

سرلیش - کتنے ہی قصبے انھوں نے جلا ڈالے ہیں۔ لوگ دھڑا دھڑ دیہات خالی کرتے جا رہے ہیں۔

اقبال - اور شہر کونسا محفوظ رہ گیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اب جموں کا وقت بھی نزدیک ہی ہے۔ سوچیت گڑھ کے قرب و جوار میں اور ادھر اکھنور کے آس پاس تو پہنچ گئے ہیں وہ۔

سرلیش - لوگوں میں ہراس تو بہت ہے۔ کئی لوگوں نے تو کافی دنوں سے اپنے بچے ہندوستان بھیج دیتے ہیں۔ وہ ملہوترہ برادر والے اب صرف تین بھائی ہیں یہاں۔ بال بچے تو سب نے دہلی بھیج دئے ہیں۔ ان میں سے ایک مجھے کل ہی ملا تھا۔ کہہ رہا تھا ہم بھی اپنا مال بیچ رہے ہیں۔ ذرا سی گڑبڑ ہوئی اور ہم بھاگے۔

اقبال - اب مجھے بتاؤ میں اپنا کاروبار کیسے سمیٹوں۔ ریل تو پہلے ہی سے بند ہو گئی تھی۔ پٹھان کوٹ والی سڑک ابھی تک بنی نہیں۔ اور میرا خیال نہیں کہ یہ سال سے پہلے مکمل بھی ہو۔ کام کاج تو کچھ ہو نہیں رہا۔ ملازموں کی تنخواہیں بھی مفت سر پر پڑ رہی ہیں۔ کیا کریں گے یہاں رہ کر!

سرلیش - اور پھر آیندہ بھی تو حالات جلد سدھرتے دکھائی نہیں دیتے۔ سیکورٹی کونسل کا رویہ بھی تو تسلی بخش نہیں۔

اقبال - انھیں ان شعلوں کی تپش کا کیا احساس جو ہمیں جھلس رہے ہیں۔

سرلیش - خون بہتے ہوتے دیکھنا اور خاموش رہنا، آگ کو سلگتے ہوتے دیکھنا اور ہنس دینا یہی تو ہے سیاست۔ میں تو یوں محسوس کرتا ہوں جیسے کشمیر کو بھیڑیوں کے آگے پھینک دیا گیا ہے اور وہ اپنے ناخن تیز کر رہے ہیں۔ اور دانت چمکا رہے ہیں۔

اقبال - اس سے کچھ نتیجہ بھی نکلے گا؟

سرلیش - یہی کہ شعلے سلگ سلگ کر خود بجھ جائیں گے۔ خون بہہ بہہ

کر آخر سوکھ جائے گا، آنسو گر گر کر خاک میں جذب ہو جائیں گے
اور لیک سسکیس میں گونجتی ہوئی آوازیں آخر سکوت میں
ڈوب جائیں گی۔

اقبال ۔ کیا خیال ہے تمہارا پھر ؟

سرلیش ۔ بہتر ہے کہ ہم بھی ریاست سے باہر نکل سکنے کا پرمٹ
حاصل کر لیں اور بچوں کو پوربی پنجاب میں چھوڑ آئیں ۔

اقبال :۔ مگر باہر جانے کی اجازت لینا بھی تو آسان کام نہیں ۔ ریاستی باشندوں
کو تو باہر جانے کی سخت ممانعت ہے ۔

سرلیش ۔ اس سلسلہ میں کنور ہماری مدد کر سکتا ہے ۔ اس کا رسوخ ایسے
لوگوں سے ہے جو اس وقت برسر اقتدار ہیں ۔

اقبال ۔ شروع شروع میں تو اس نے بہت کام کیا تھا لیکن اب کچھ سرد
پڑ گئی ہیں اس کی سرگرمیاں ۔

سرلیش ۔ عجیب ہے وہ موڈ کا آدمی ۔ پرسوں مجھے ملا تھا کہہ رہا تھا اب
ریاست میں نہیں رہوں گا ۔ یہاں سے چلا جاؤں گا ۔ یہ لوگ انسان
کی قدر کرنا نہیں جانتے ۔

اقبال ۔ ہاں اُسے کیا وہ جا کر کسی اخبار کے دفتر میں ملازم ہو جائے گا ۔
پریس میں تو اس کی کافی چلتی ہے ۔ اگر تو وہ خود بھی جانے کو راضی
ہو جائے پھر تو کام بن جائے گا ۔

سرلیش ۔ کہہ تو رہا تھا لیکن ہے وہ آزاد آدمی ۔ ذمہ داری اس پر ہے
کوئی نہیں ۔ ہو سکتا ہے اس نے صلاح بدل ڈالی ہو ۔ وہ ایک رات
میں بیسیوں منصوبے باندھتا اور توڑتا ہے ۔

(دروازہ کا پردہ اٹھتا ہے اور کمرہ کے اندر کنور داخل ہوتا ہے ۔
وہ ایک کمزور سا نوجوان ہے ۔ اس کے لباس سے لاپرواہی ٹپکتی
ہے ۔ اس کے چہرے پر ذہانت اور سنجیدگی کا امتزاج ہے)

اقبال ۔ ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے ۔

سرلیش ۔ تھنک آف دی ۔۔۔

کنور ۔ اینڈ دیر ہی از ۔

(ایک ہلکا سا قہقہہ گونجتا ہے اور پھر تینوں سیٹ میں دھنس جاتے
ہیں)

کنور ۔ خاکسار کو کیوں یاد کیا جا رہا تھا ؟

اقبال ۔ اب تم لیڈر جو بن گئے ہو ۔

سرلیش ۔ اور جب تکلیفوں سے گھر جائیں تو عوام پھر یا اپنے لیڈروں کو
یاد کرتے ہیں یا خدا کو ۔ کئی بار اچھے الفاظ سے اور کتنی بار گالیوں سے

کنور ۔ مگر تم پر تو کوئی بات لاگو نہیں ہوتی ۔ نہ ہی تم ایک عام شہری ہو
اور نہ ہی تمہیں کوئی تکلیف ہے ۔ اس وقت تو دکھی جنتا تمہارے
جیسے امیر لوگوں کی طرف دیکھ رہی ہے ۔ تمہیں ان کی مدد کرنا ہے

اقبال ۔ چھوڑو اس فلسفے کو ، یہ باتیں تو ہم روز سنتے ہیں ، میرے پاس آنے والا
ہر آدمی یہی پیغام لے کر آتا ہے ۔

سرلیش ۔ تم ہمیں یہ بتاؤ کہ اب حالات کیسے ہیں ۔

کنور ۔ حالات اب پہلے کی نسبت کافی سدھر گئے ہیں ۔ لیکن ابھی خطرہ
ٹل نہیں گیا ۔ حملہ آور حدود پر خوب طاقت جمع کر رہے ہیں ۔

اقبال ۔ اور ہندوستانی فوجیں کیا کر رہی ہیں یہاں ۔ اب تک لٹیروں

کو بھگا نہیں سکیں ۔

کنور ۔ بھائی وہ خاص ہدایات کے مطابق کام کر رہی ہیں ۔ سرکار کی اپنی پالیسی ہے ۔ ورنہ ہمارے سپاہی اُن کا پیچھا کرتے کرتے انھیں اُن کے علاقے میں دور اندر تک دھکیل سکتے ہیں ۔

سرلیش ۔ آخر حملہ آور بھی تو کسی خاص نظم کے تحت کام کر رہے ہیں ان کی انفرادی حیثیت تو کچھ نہیں ۔ وہ مجموعی طور پر ایک خاص پالیسی پر عمل پیرا ہیں ۔ لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت ۔

کنور ۔ یہ ٹھیک ہے ۔

اقبال ۔ دیکھو کنور میرے بہت سے رشتہ دار میرپور اور بھمبر میں کاروبار کرتے تھے ۔ اُن میں سے کئی تو مارے گئے ہیں کئی ابھی تک لاپتہ ہیں اور جو یہاں پہنچے ہیں وہ قلاش بن کر ۔

کنور ۔ مظالم تو واقعی بے پناہ کئے گئے ہیں ۔ خود درندگی اور بہیمیت نے سر جھکا لیا ہے ۔

اقبال ۔ میرا دل تو اب ڈول گیا ہے ۔ یہی حشر اگر ہمارا ہوا تو پھر! میں نے اور سرلیش نے صلاح کی ہے کہ بچوں کو ریاست سے باہر بھیج دیں اور خود یہاں رہیں ۔

سرلیش ۔ ہاں یہی فیصلہ کیا ہے ہم نے (تائید میں سر ہلاتا ہے) لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں سے باہر جانے کی اجازت کس طرح حاصل کی جائے ۔ سنا ہے آج کل اس معاملہ میں بہت سختی سے کام لیا جا رہا ہے ۔

کنور ۔ اور سختی کرنی بھی چاہیے ۔ نہیں تو سرمایہ دار طبقہ تو سارا یہاں

سے چلا جائے گا ، رہ جائیں گے عوام جو خود بمشکل اپنا گذارہ کر رہے ہیں ۔ اور یہ جو ہزاروں کی تعداد میں پناہ گیر ہیں انھیں سنبھالنا سرکار کا کام نہیں تم لوگوں کا ہے ۔ سرکار ملک کی حفاظت کرے اور تم لوگ ان بے بسوں کا خیال کرو ، یہی طریقہ ہے اس دور میں سے کامیاب طریقے سے گذرنے کا ۔

سرلیش ۔ تم تو خود یہاں سے چلے جانے کو کہہ رہے تھے ۔

کنور ۔ جہاں تک میرے ذاتی مفاد کا تعلق ہے مجھے یہاں سے چلا ہی جانا چاہیے ۔ لیکن اس وقت ذاتی مفاد کو ملک کے مفاد پر قربان کر دینے میں ہی بہتری ہے ملک کے زندہ رہنے سے ہی ہم زندہ ہیں ۔ کشمیر کی حسین وادیوں میں اگر شعلے بھڑکیں اور تلواروں کا ناچ ہو تو کون ہے انسان جس نے اِن وادیوں میں کھلے پھولوں کی باس سے من کو بھرمایا ہو ، اُن کے برفیلے چشموں سے دل کو ٹھنڈک پہونچائی ہو ، اُن کے جھرنوں سے گیتوں کی تخلیق کی ہو اور اب یہاں سے بھاگ جائے کیونکہ وہ شعلوں کی تپش نہیں سہہ سکتا ۔

اقبال ۔ لیکن اپنے آپ کو شعلوں سے بچانا تو کوئی جرم نہیں ۔

کنور ۔ اگر اسی طرح ہر ایک شہری اپنے مکانوں کو ، اپنے بچوں کو ، اور خود کو شعلوں سے بچانے لگ جائے تو ہر طرف پھیلتی ہوئی اس بھیانک آگ پر پانی کے چھینٹے کون پھینکے گا ؟ یہ سلگتی ہوئی آگ کشمیر کی خوبصورت وادیوں کو جھلس کر ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچ جائے گی اور یہاں سے ڈر کر بھاگے ہوئے لوگ وہاں بھی اُس کی لپیٹ میں آ جائیں گے ۔

سرلیش - اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو اس جوالا مکھی کنڈ میں آہوتی بنا ڈالنا بھی تو عقلمندی نہیں ؟

کنور - ایسا کرنے کو کہتا کون ہے تمھیں ؟ تم اس آگ میں جھلسے ہوئے انسانوں کے زخموں پر سکون دہ پھاہے رکھو ۔ تم ان بے گھر لوگوں کو اپنے گھروں میں لے آؤ اور انھیں جاڑوں کی سرد راتوں میں میدانوں میں پڑے ٹھٹھرنے سے بچاؤ ۔ نہیں تو تمھارے یہ اونچے اونچے مکان گرا دئے جائیں گے اور تم لوگ اینٹوں اور مٹی کے ڈھیروں تلے دبے سسکتے رہوگے ۔

اقبال - اور تم ایک طرف کھڑے تالیاں پیٹوگے ۔

کنور - ہاں میں تالیاں پیٹوں گا کیونکہ ان گری ہوئی اینٹوں اور مٹی کے ڈھیروں سے کئی اور جھونپڑیاں بن سکیں گی ۔ جہاں پہلے صرف ایک خاندان رہتا تھا پھر وہاں کئی خاندان رہیں گے ، کئی اُجڑے ہوئے بے گھر لوگ اور نیا نظام انہی جھونپڑیوں میں پروان چڑھے گا ۔ جب پرانا نظام اونچے اونچے کنگاروں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا تو دور نظر آتے ہوئے اُن گہرے گڑھوں میں نئے نظام کا جنم ہوگا ۔

سرلیش ۔ میاں یہ اقبال کا گھر ہے کوئی جلسہ گاہ نہیں ۔ تم تو تقریر جھاڑنے لگے ہو اور ہم تم سے مشورہ لینا چاہتے تھے ۔

کنور - میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ تم یہاں سے باہر نہ جاؤ ۔ اور اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو تمھاری تمام جائداد ضبط ہوجانی چاہئے ۔ تمھیں کوئی حق نہیں کہ یہاں کے غریب عوام کی جیبوں سے کھینچا ہوا روپیہ

تم ریاست سے باہر لے جاؤ ۔ تمھیں یہاں سے اس طرح نکالا جانا چاہئے جیسے لوگوں کو ریاست کے دوسرے علاقوں سے یہاں لایا گیا ہے ۔

اقبال ۔ خیر تم اچھے ہمدرد ہو سب مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی ۔

کنور - مجھے بھی تم سے اس فیصلہ کی امید نہ تھی ۔ نو بج رہے ہیں اور مجھے ایک میٹنگ میں شامل ہونا ہے ۔ میں اب چلتا ہوں ۔

(کنور کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

سُرلیش - بڑا احمق آدمی ہے ۔

اقبال - آدمی تو صاف دل کا ہے مگر ہے جذباتی ۔ چلو ذرا باہر گھوم آئیں ۔ طبیعت کا بھاری پن کم ہو جائے گا ۔

(دونوں کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں اور لائن میں کھڑی کار میں بیٹھ کر بنگلے سے باہر نکل جاتے ہیں ۔)

(۲)

نظارہ ۔

صبح کے دس بجے ہیں ۔

کنور کے مکان کا ایک کمرہ ۔ جنوبی دیوار کے پہلو میں ایک جھلنگا سی کھاٹ پڑی ہے ۔ رات کا بچھا ہوا بستر ابھی تک لپیٹا نہیں گیا ۔ کھاٹ کے سامنے لوہے کی ایک کرسی ہے اور بالیں کی طرف ایک الماری جس میں بے ترتیبی سے کتابیں پڑی ہیں ۔ کنور چارپائی پر بیٹھا سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا ہے اور کوئی کتاب پڑھنے میں محو ہے ۔

(ڈیوڑھی کے دروازہ پر دستک ہوتی ہے)

کنور۔ (اپنے کمرے سے ہی) اندر آجایئے۔

(چند لمحے انتظار کرنے کے بعد خود ڈیوڑھی میں جاتا ہے)

کنور۔ (حیرت سے) کون؟ کلا!

کلا۔ نمستے۔

کنور۔ نمستے۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ تم باہر کیوں کھڑی ہو گئیں۔

(دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور کلا کمرے کا جائزہ لینے لگتی ہے)

کنور۔ (چارپائی کی پائینتی سے تولیہ اٹھا کر کرسی کو جھاڑنے لگتا ہے) بہت دنوں سے صفائی نہیں کی۔

کلا۔ (تولیہ اس کے ہاتھ سے لے لیتی ہے) رہنے دو، اس پر دھول تھوڑے ہی ہے۔ تم جھاڑ کیا رہے ہو؟

کنور۔ (کلا کی طرف دیکھ کر) یہ تمھارا ذہن نہیں میرا کمرہ ہے۔ یہاں میری لاپرواہی کے کارن لمحات کی اُڑتے ہوئے ذرے اکثر جم جایا کرتے ہیں۔

کلا۔ اور تم اسے تکلف کے جھاڑن سے صاف کر دیتے ہو۔

(دونوں مسکرانے لگتے ہیں)

کنور۔ تم بغیر اطلاع دئے آ کس طرح گئیں۔

کلا۔ جس طرح تپتے ہوئے صحراؤں میں بہار آجاتی ہے۔ جس طرح گلاب کی پنکھڑیوں میں شبنم کی بوندیں لرزنے لگتی ہیں۔

کنور۔ (جذبات سے مغلوب ہو کر) کلا!

کلا۔ میں نے سوچا تھا میرے اچانک اور بغیر اطلاع دئے چلے جانے

پر تمھیں بہت دُکھ ہوگا۔ تم چاند اور تاروں کو میری کھوج میں دوڑاؤ گے تم سورج کی پہلی کرنوں پر اپنا سندیسہ لکھ کر مجھے بھیجو گے۔ تم میرے لئے پاگل ہو جانے کی حد تک مضطرب ہو گے۔ لیکن میرا اندازہ شاید غلط تھا۔

کنور۔ کیسے؟

کلا۔ پریم کو میرا ایڈریس معلوم تھا اس کے خط مجھے اکثر آتے تھے، اُن میں تمھارے متعلق لکھا ہوتا تھا کہ اب تم پہلے کی نسبت زیادہ خوش ہو۔ تمھارے چہرے پر اضطراب کا کوئی نشان نہیں۔ تم دنیا کے کاموں میں پہلے سے زیادہ انہماک دکھا رہے ہو؟

کنور۔ مگر مجھے تو پریم نے تمھارا ایڈریس نہیں بتلایا؟

کلا۔ تم نے پوچھا ہی کب تھا اس سے؟ میں نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ تمھارے سامنے میرے متعلق کوئی بات نہ کرے اور ایڈریس بھی صرف تمھارے پوچھنے پر بتلائے۔

کنور۔ میں نے چاند اور تاروں کو تمھارے پیچھے نہیں دوڑایا تھا کہ دنیا اُن کی روشنی سے محروم ہو جائے گی، میں نے سورج کی کرنوں پر اپنا سندیسہ نہیں لکھا کہ تم اس کی تپش سے گھبرا نہ جاؤ، میں تمھاری جدائی کے غم سے پاگل نہیں ہوا کہ لوگ تمھیں بدنام کریں گے۔ میں نے تمھیں ڈھونڈنے کے لئے تخیل کی کمندیں پھینکیں اور رات کی تنہائیوں میں تمھیں یاد کیا۔

کلا۔ لیکن اس میں تم کامیاب نہیں ہوئے۔ تمھارے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت تمھارے قلبی اضطراب کی [illegible]

یہ انتشاری کیفیت تمھارے ذہن کا عکس ہے تم اپنی گفتگو میں لاکھ محتاط سہی لیکن تمھارا کردار تمہاری ذہنی تلخی کی جھلک کھاتا ہے۔

کنور۔ شاید

کلا۔ پریم نے اپنے کسی خط میں لکھا تھا کہ تم اب بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو اور قوت ارادی کھوتے جا رہے ہو، کسی عقیدے

کسی پر آڑے رہنا اب تمھارے کریکٹر کا جزو نہیں رہا اور کہ تم نے اپنی ذہنی الجھنوں سے تنگ آکر خود کو سیاسی سرگرمیوں میں غرق کر دینے کی حد تک لگا دیا ہے۔

کنور۔ مگر ان سب باتوں کا تمھاری آمد سے کیا تعلق ہے؟

کلا۔ جو بہار کو خزاں سے اور شبنم کو پھولوں سے ہوتا ہے۔ میں نے پانچ چھ ماہ کا یہ عرصہ دہلی میں گذارا ہے۔ اس دوران میں پریم کے خط مجھے متواتر آتے تھے اور تمھارے متعلق مجھے ہر قسم کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ مجھے کشمیر کی تباہی کا حال پڑھ کر بہت دکھ ہوتا تھا لیکن اس میں تمھاری تعمیری سرگرمیوں کا ذکر مجھے تسکین دیتا۔ اب اور زیادہ عرصہ دور بیٹھے رہنا اور تمھارے متعلق صرف خبریں سن کر دل کو تسلی دینا ممکن نہیں رہا۔ آخر خود آگئی ہوں یہاں تمھارے ساتھ کام کرنے کو

کنور۔ میں اس کے لئے تمھارا شکر گذار ہوں۔

کلا۔ پریم فیملی کا کیا حال ہے۔

کنور۔ وہ تو تیار بیٹھے ہیں۔ ابھی دو دن ہوئے سریش مجھے ملا تھا اور اس کے ساتھ اس کا دوست اقبال تھا وہ دونوں ریاست سے باہر

جانے کا پرمٹ بنوانے کو کہہ رہے تھے۔

کلا۔ پریم نے یہ تو لکھا تھا کہ اُس کے خاوند کچھ عرصہ کے لئے پوربی پنجاب میں چلے جانے کا خیال کر رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ فیصلہ ہی کر لیا ہے اس کا مجھے علم نہیں۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کنور صاحب۔ کنور صاحب۔)

کنور۔ یہ کمبخت وقت بے وقت بھی تو نہیں دیکھتے۔ ہوگا کوئی شرنارتھی، ذرا سی تکلیف ہو تو بھاگے آتے ہیں۔ ٹھیرو میں اسے فارغ کر آؤں

(کنور تھوڑی دیر کے بعد واپس آتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں اقبال اور سریش داخل ہوتے ہیں)

سریش۔ نمستے

اقبال۔ نمستے

کلا۔ نمستے۔ تشریف رکھئے (خود کرسی سے اٹھنے لگتی ہے)

سریش۔ نہیں نہیں آپ بیٹھی رہیں۔ ہم یہاں چارپائی پر بیٹھیں گے (وہ دونوں چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں)

کلا۔ کہیے پریم کیسی ہے۔

سریش۔ بالکل اچھی ہے۔ مگر آپ کب پہنچیں یہاں؟

کلا۔ میں کل شام پہنچی تھی۔

سریش۔ پریم نے تو شاید ابھی کل خط پوسٹ کیا ہے آپ کو جس میں اس نے اپنے یہاں سے روانہ ہونے کی اطلاع دی ہے۔

کلا۔ تو آپ نے پریم کو ریاست چھوڑنے پر راضی کر ہی لیا۔

سریش۔ (کھسیانہ سا ہو کر ہنس دیتا ہے) جی ہاں بہت مشکل

سے۔

کنور ۔ ٹھیرو میں ذرا چا ر کا انتظام کروں۔

اقبال ۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔

سرلیش ۔ یہ بات کنواروں کو زیب نہیں دیتی ۔

(چاروں ہنس دیتے ہیں)

کنور ۔ اچھا نہ ہی کسی خاص کام سے تو نہیں آئے تم ؟

سرلیش ۔ صرف تمہیں ملنے آئے ہیں ۔ ہمارا پرمٹ بن گیا ہے اور ہم کل جا رہے ہیں (جیب میں سے پرمٹ نکال کر دکھاتا ہے)

کنور ۔ یعنی تم نے میری مدد کے بغیر ہی اجازت حاصل کر لی ۔

اقبال ۔ (طنزیہ لہجہ میں) جی

کنور ۔ لیکن میری مدد کے بغیر تم یہاں سے جا نہیں سکتے ۔

کلا ۔ آخر بات کیا ہے ؟

کنور ۔ یہ پونجی پتی اپنا سونا اور روپیہ ٹھکانے لگانے کے لئے یہاں سے بھاگنا چاہتے ہیں اور کیا ۔

کلا مگر اب تو حالات اچھے ہیں ، اب تو تمھاری اپنی سرکار ہے اب تو ڈر کی کوئی وجہ نہیں ۔

اقبال ۔ ہم مستقل طور پر تو نہیں جا رہے ۔ بچوں کو مشرقی پنجاب میں چھوڑ کر واپس آجائیں گے ۔

کلا ۔ یعنی اپنی ذمہ داری گھٹانے کا خیال ہے ۔

سرلیش ۔ جی بالکل ۔

کلا ۔ لیکن پریم تو نہ جا سکے گی ۔

سرلیش ۔ (حیرت سے) کیوں ؟

کلا ۔ اب میں جو یہاں آگئی ہوں ۔

کنور ۔ اور کلا دہلی سے صرف اس لئے آئی ہے کہ وہ بھی موجودہ سرگرمیوں میں حصّہ لے سکے ۔

کلا ۔ میں یہاں عورتوں کو منظم کروں گی اور انھیں بھی فوجی ٹریننگ دلواؤں گی ۔ عورت کی دنیا صرف گھر کا محدود آنگن ہی نہیں گولیوں اور توپوں کی آوازوں سے گونجتے ہوئے محاذ بھی ہو سکتے ہیں ۔

اقبال ۔ مگر عورت کے ہاتھ میں بندوق کچھ اچھی نہیں لگتی ۔ اس کے ہاتھ میں تو پھولوں کا گچھا ، جلتی ہوئی شمع ، اور کوئی خوبصورت پینٹنگ ہی بھلی لگتی ہے ۔

کلا ۔ کتنے خود غرض ہیں مرد ۔ بازاری عورتوں کا کام بھی وہ اپنی بیویوں سے ہی لینا چاہتے ہیں ۔

اقبال ۔ (لجاجت سے) میرا یہ مطلب تو نہیں تھا ۔

سرلیش ۔ کئی دفعہ تم بیوقوفوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہو ۔

کلا ۔ (اقبال سے مخاطب ہو کر) آپ کی سسر کو بھی ہماری پارٹی میں شامل ہونا ہوگا ، کہئے کیا خیال ہے ؟

اقبال ۔ (مجبور ہو کر) بہت اچھا ۔

کنور ۔ ہاں اور یہ تمھارا پرمٹ شام تک کینسل ہو جائے گا ۔

(سرلیش اور اقبال غصّہ سے اسکی طرف دیکھتے ہیں)

کنور- اور ہمیں کیمپ میں بچوں کے لئے دودھ کے ڈبے چاہئیں۔
باہر سے دودھ بہت کم آرہا ہے۔ کل تک دودھ کا انتظام ہو
جانا چاہئے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم عوام کی ہمدردی
حاصل کرسکتے ہو۔ اور جنتا کی ہمدردی کسی بھی انسان کے
لئے دشمن کے خلاف سب سے مضبوط ہتھیار رہے۔

اقبال- بہت اچھا۔

سرلیش- اور اپنی کوٹھی کا ایک حصہ شرنارتھیوں کے لئے وقف
کردو، وہ باہر سردی میں ٹھٹھرتے ہیں۔ کہا تھا نا کہ کنور کو ملنے
نہ چلو وہ کوئی اور اڑچن کھڑی کردے گا۔

کلا- آپ پریم سے کہہ دیجئے گا میں شام کے تین بجے اُسے ملوں گی۔
میرے ساتھ دو ایک عورتیں اور بھی ہوں گی اور ہم چاء بھی
وہیں پئیں گی۔

سرلیش- (مجبوری سے) بہت اچھا۔

اقبال- چلو اب دودھ کا انتظام کریں۔

(سب ہنس دیتے ہیں اور سرلیش اور اقبال چارپائی سے اٹھ کر
دروازے کے قریب پہنچ جاتے ہیں)

کلا- پریم کو ساتھ لے کر میں آپ کے ہاں بھی آؤں گی اقبال صاحب۔

اقبال- ہم بھی آپ کا انتظار کریں گے۔

(سرلیش اور اقبال چلے جاتے ہیں)

کنور- تم نے تو بچاروں کا بنا بنایا کام خراب کردیا۔

کلا- زندگی کا بیشتر حصہ ایسے ہی لمحوں سے بھرا پڑا ہے شکستوں

اور ارادوں کی یہ کشمکش ہی انسانی زندگی کے ارتقا کی ذمہ دار
ہے۔ غار میں رہنے والے انسان سے لے کر ستاروں کو روندنے
والے انسان تک یہی ایک مشترکہ میراث ہے۔

کنور- اس کشمکش سے بعض دفعہ انسان تھک بھی تو جاتا ہے۔

کلا- اور اس وقت اسے ابھارنے کے لئے قدرت کوئی نہ کوئی انتظام
کردیتی ہے۔ تم کام کرتے کرتے تھک گئے ہو اور اب میں تمہارے
تھکے ہوئے اعضا کو دبانے کے لئے پہونچی ہوں۔

کنور- اور ہم دونوں ماتری بھومی کے خون بھرے زخموں پر پھاہے
رکھیں گے۔ میں نوجوانوں کا شاعر ہوں۔ میں اپنی نظموں سے
اُن کی ڈوبتی ہوئی نبضوں میں خون دوڑاؤں گا میں اُن کے
تھکے ہوئے ہاتھوں میں تلوار دوں گا اور تم عورتوں کو تیار
کرنا کہ وہ جے مالا پہنا کر اپنے مردوں اور بھائیوں کو میدانِ
جنگ میں بھیجیں اور خود فتح کے گیت گائیں۔

(ہلکا سا نغمہ جو لحظہ بہ لحظہ ابھرتا ہے)

کلا- (رُک رُک کر) اور ہم دونوں زندگی کی بے پناہ وسعت میں
کھڑے نئے نظام کو ابھرتے ہوئے دیکھیں گے۔ نیا نظام جو
صدیوں کے جمے کہرے میں کسمسا رہا ہے۔

(نغمہ بلند ہوتے ہوتے عروج پر پہونچ جاتا ہے اور پھر
آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگتا ہے)

— ٭ —

بہن اور ماں

آج تقریباً چالیس سال گزر گئے ہیں اس بات کو۔

قصبے کے ایک کچے سے تنگ مکان کے محدود آنگن میں دو بچے کھیلا کرتے تھے۔ بچوں کی عمر میں دو، ڈھائی سال کا ہی فرق تھا۔ مکان کا آنگن بھی اس میں رہنے والی عورت کی طرح ناہموار تھا۔ اس کی زندگی میں گڑھے ہی گڑھے تھے، کم گہرے، گہرے، بہت گہرے اور اس نے ان گڑھوں کو اکثر اپنے آنسوؤں سے بھرا تھا اور ان میں اپنی ازدواجی زندگی کے زرد، مٹیلے اور کالے عکس ڈولتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس ناہموار آنگن کے گڑھوں میں ماحول کی تیز دھوپ میں جھلس کر سات کیڑے مر گئے تھے۔ یہ دو کیڑے زندگی کی سرکتی ہوئی رسی پر مضبوطی سے اپنے پاؤں جمائے کھڑے تھے۔ وہ عورت اپنے بچوں کو کیڑوں کے نام سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ اب وہ انڈے سینے کی عمر سے گزر چکی تھی اور اس کا ساتھی صحن کے گڑھوں میں سوراخ کرتے کرتے شاید پاتال کی گہرائیوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ عرش کی بلندیاں گڑھوں میں رہنے والوں کو نصیب ہی کہاں!

اُن کی ماں بیوہ تھی، کالی چادر اوڑھ کر لوگوں کے گھروں میں کام

کرتی رہی اور بچے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔

"ماں یہ داس مجھے ہر وقت پیٹتا رہتا ہے"

"بہنوں کو نہیں پیٹا کرتے بیٹا، لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں،" ماں کے یہ الفاظ مکمل ہونے سے پہلے داس بہن کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹنے لگتا جیسے یہ اس کی اپنی ملکیت ہو، اس کے ساتھ جو سلوک چاہے وہ کرے۔

داس ہر روز پرمیشوری کو پیٹنے پر پٹتا اور پرمیشوری کی گالیاں، موا اور مردود صحن کی کچی اور نیچی دیواروں کو پھلانگ کر ہمسایوں کے کانوں سے ٹکراتیں اور ہمسائے سوچتے کہ یہ داس کتنا بے شرم اور ڈھیٹ ہے۔ اُسے اپنی حیثیت کا جیسے کوئی علم ہی نہ ہو۔ وہ محلے کے بچوں کو پیٹتا، انھیں گالیاں دیتا۔ وہ اپنی بہن کو ستاتا اور ماں کو کوسنے دیتا اور جب اسے سکول میں داخل کروایا گیا تو اس نے وہاں استادوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ ایک دن ٹوٹی ہوئی سوئی کا ایک حصہ اُس نے کرسی پر گاڑ دیا۔ ماسٹر جماعت میں آیا اور کام نہ کرنے والے لڑکوں کو دھمکا کر کرسی میں بیٹھا، بیٹھا کیا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک لگا دیا ہو، بلبلاتا ہوا اٹھا اور غصے سے چیخنے کی حد تک اونچی گالیاں دینے لگا۔ اور اُس دن داس نے سکول کا کام نہیں کیا تھا اور جماعت میں آتے ہی سب سے پہلے اُسے مار پڑی تھی۔

دوسروں کو ستانا، تنگ کرنا، گستاخی سے پیش آنا رفتہ رفتہ داس کی فطرت میں شامل ہو گیا۔ اپنے سے بڑے انسان کو کسی نہ کسی طرح دکھ دے کر وہ ایک سکون کا احساس کرتا۔ اُس کی کچلی ہوئی شخصیت زخمی ناگن کی طرح وار کرنے

والے پر چھپٹتی اور اپنے تفوق کا اظہار کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کا یہ جذبہ استوار ہوتا گیا وہ دنیا کی ہر چیز سے گستاخی سے پیش آئے گا۔ اس کی اپنی زندگی بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی اور ایک وقت ایسا آ گیا جب اس کے تحت الشعور میں پرورش پاتا ہوا جوالا مکھی پھٹ پڑا اس کے گھر کے در و دیوار ہل گئے اور وہ انہیں جھٹکے دیتا ہوا کہیں غائب ہو گیا اپنی ادھیڑ عمر کی بیوہ ماں اور آٹھ نو سال کی بہن کو چھوڑ کر، اور اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اس کی ماں نے اپنے سینے پر صبر کی ایک بھاری چٹان رکھ کر خود کو کچل ڈالا۔ وہ دو ایک سال زندہ رہی۔ لیکن زندگی سے کوئی بھی ناطہ رکھے بغیر۔ وہ پرمیشوری کو فقط کسی کے محفوظ ہاتھوں میں سونپنا چاہتی تھی۔ جب اُس کی اپنی دانست کے مطابق اسے محفوظ ہاتھوں کی اوٹ نظر آ گئی، جب اُس نے اپنی بارہ سالہ گڑیاں کھیلتی ہوئی لڑکی کو ازدواجی زندگی کے چھکڑے کے آگے جوت دیا تو خود دنیا سے اُٹھ گئی۔ اُسے احساس تھا کہ اس کی کمزور اور کم عمر بچی شاید اتنے بوجھل چھکڑے کو نہ کھینچ سکے اور آخر تھکن اور ضعف سے ہانپ کر راستے ہی میں دم توڑ جائے اور وہ دور کھڑی اس بھیانک واقعہ کو دیکھتی رہے، دیکھتی رہے اور خود کو نوچتی رہے۔ یہ تو اور بات تھی کہ چھکڑے کا مالک ایک سمجھدار اور حساس آدمی تھا۔ اُس نے اُسے ہانکنے کی بجائے اپنے سرسبز کھیتوں، ٹھنڈے پانی کے جھرنوں، اور تازہ ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے چھوڑ دیا۔ لیکن پرمیشوری جو ایک بیوہ کی بچی تھی، جس کا بھائی دکھوں سے نجات پانے کے لئے کہیں بھاگ گیا تھا، جس کی اپنی زندگی میں پورے نو سال تک زہریلے مادے پرورش پاتے رہے تھے، جسمانی اور ذہنی دونوں لحاظ سے تندرست انسان نہ بن سکی، وہ اپنے خون

میں رینگتے ہوئے اِس زہر کو ایک جگہ اکٹھا کرتی رہی اور تین سال کے بعد اُس نے اس ڈھیر کو باہر اُگل دیا۔ اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ سسرال میں خوشیاں منائی گئیں، بتاشے بانٹے گئے تین بھینس اور ایک گھوڑی حویلی میں باندھ دی گئی، اپنے مزارعوں میں جی کھول کر اناج بانٹا گیا اور مکان کی ایک اندھیری اور تیرہ جس کوٹھڑی میں فرش پر پڑی ادھ مری پرمیشوری دیئے کی مدھم سی لرزتی ہوئی روشنی کی لرزتی ہوئی پرچھائیوں کو گھورتے ہوئے کچھ سوچتی رہی، بوڑھی عورتیں باری باری اس کے نڈھال جسم کو دباتی رہیں اور پہلو میں پڑا زہر کا ڈھیر کبھی کبھی چیخ کر اپنے وجود کا احساس کراتا رہا۔

تیرھواں نہا کر جب وہ اپنے آنگن میں آئی تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے پچھلے بارہ دن اس نے جہنم کے کسی گوشے میں گزارے تھے، تاریکی اور گھٹن کے درمیان اور اس کا آنگن کتنا صاف اور ہموار تھا اور اس نے بازوؤں میں تھامے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور اُسے چوم لیا اور پھر اس کے زرد چہرے پر شرم کی سُرخی پھیل گئی جیسے خزاں رسیدہ پتوں کو شفق کی کرنیں چھو جائیں۔ اس نے ایک فن کار کی طرح اپنی تخلیق کو دیکھا اس نے غار کے اندھیرے میں ایک طویل عرصہ اُسے گھڑنے میں صرف کیا تھا۔ تاریکی میں اُسے اس کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہ ہو سکی تھی اور اب جگ میں پھیلے ہوئے نور میں اسے وہ ایک سندرتا نظر آیا اور اس کی نظریں غیر ارادی طور پر کچھ عرصہ کے لئے اس پر جم گئیں اور وہ بھول گئی کہ وہ بچہ تاریکی، زہر اور گھٹن کی کوکھ سے نکلا تھا —— اور اس دن شام کو وردی پہنے ایک سپاہی کھٹ سے بے شرموں کی طرح اُن کے آنگن

میں آگھسا۔

"جمیعت رائے زمیندار کا مکان یہی ہے؟" اس نے تحکمانہ انداز میں پوچھا اور ایک کونے میں بیٹھی پرمیشوری نے گھونگٹ کھینچ لیا اور خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سپاہیوں سے اُسے ہمیشہ ہی خوف آیا کرتا تھا بچپن میں بھی جب کبھی وہ کسی سپاہی کو گلی میں گذرتے ہوئے دیکھتی تو فوراً اندر بھاگ آتی اور گھنٹوں سسکتی رہتی۔ اس کے باپ کو بھی ایک دفعہ کچھ سپاہی شبہ میں پکڑ کر لے گئے تھے اور اسے خوب پیٹا تھا۔ اور گندی گندی گالیاں دی تھیں۔ یہ باتیں اُس نے اپنی ماں سے سُنی تھیں اور اُسے سپاہیوں سے خوف آنے لگا تھا اور یہ خوف آخر نفرت میں بدل گیا تھا۔ اس نے آنگن میں کھڑے اس سپاہی کو گھونگٹ میں سے ایک بار پھر دیکھا اور نفرت کا ایک بے پناہ جذبہ اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا جو اُس سپاہی کو کوئی جواب دیتا۔ وہ جھنجھلا رہی تھی اور سامنے کھڑا سپاہی بظاہر غصّے سے پوچھ رہا تھا۔

"کہاں ہے جمیعت رائے زمیندار؟"

اور پھر لمحہ بھر ٹھہر کر اس نے کہا۔

"پرمیشوری میں ہوں تمھارا بھائی بُوا داس" —— اور پرمیشوری کو یوں محسوس ہوا جیسے جواہرات کا ایک ڈھیر اُٹھاتے وقت کہیں سے ایک بڑا اژدہا اس پر پھنکارنے لگا تھا۔ شک کا سیاہ اژدہا۔

اس کا بھائی تو مدت ہوئی گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اس نے کبھی اس کے متعلق کوئی خبر نہ سنی تھی، اگر وہ کہیں موجود تھا، تو ماں کی موت پر کیوں نہ پہنچا تھا؟ لیکن اسے میرا نام کیسے معلوم ہو گیا؟

"مجھے پہچانتی نہیں ہو؟" وہ چند قدم اور آگے بڑھا اور پرمیشوری کی گود سے اُس کے بچے کو اٹھا لیا اور پرمیشوری کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں لرزنے لگی۔ اتنے میں اس کے گھر کے اور لوگ بھی آگئے اور شک کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے ان سب سے اچھی طرح اپنا تعارف کروایا تھا۔

پرمیشوری دیر تک گھونگٹ میں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کا بھائی پولیس کا سپاہی تھا اور کشمیر سے اُسے ملنے آیا تھا، کشمیر جس کی دلکشی اس کے اپنے انگ انگ میں بھری تھی، کشمیر جس کی فضاؤں میں اس نے اپنا تلخ بچپن گزارا تھا۔

بوا داس دو ایک دن وہاں رہ کر واپس چلا گیا اور اپنی بہن کو ایک نئی امید، ایک نیا ولولہ، ایک نیا جذبہ دے گیا۔ اب وہ دنیا میں اکیلی نہیں تھی، اس کا بھائی بھی تھا جسے وہ اپنے دکھ سکھ میں شریک کر سکتی تھی اور چند روز کے بعد جب راکھی کا تہوار آیا تو اس نے اُسے ایک ساتھ سات راکھیاں بھیجیں، جیسے وہ پچھلے سات سال کے خلا کو پُر کر رہی ہو، اور اسے اپنی محبت کے بندھن میں مضبوطی سے جکڑ رہی ہو، اب وہ اُسے کہیں نہ بھاگنے دے گی —— اور کئی دنوں تک وہ سُکر کے سے عالم میں رہی۔

رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس شرمیلی جھینپو اور دکھ بھرے حسّاس دل والی بیوہ ماں کی لڑکی اور اس اُجڈ، باغی اور گستاخ سپاہی دونوں سے میرا گہرا اور اٹوٹ رشتہ تھا۔ تیکھے احساس والی لڑکی جسے گڑیوں سے کھیلنے کی عمر میں گڑیوں سے محروم کر کے گرہست کی قید میں ٹھونس دیا تھا، میری ماں تھی اور اُسے سینے، ستارے [illegible]

والا ضدی لڑکا میرا ماموں۔ اور آج بھی جب میں اپنی ماں کے تیکھے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ مجھے ایک گڑیا سی نظر آتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک مستقل سوال ہے جو وہ ہر کسی سے پوچھتی ہے۔ گڑیوں اور کھلونوں سے کھیلنے کی حسرت نے اپنے آپ کو کچل کر اُسے ایک گڑیا بنا ڈالا ہے۔

جب میری عمر سات سال کی تھی تو ایک دن ایک کاغذ کو پڑھ کر تمام گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ ماں پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ گھنٹے میں کئی کئی بار وہ بے ہوش ہو جاتی تھی۔ اُس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے جا رہے تھے۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو کھول کر منہ میں پانی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اُس نے سر کے بال نوچ ڈالے تھے اور فرش پر، سر پٹک پٹک کر لہولہان کر لیا تھا۔ دوسرے روز جب سفر کی تیاری شروع ہوئی تو میں جان سکا کہ وہ کاغذ میرے ماموں کی موت کی خبر تھی اور میری ماں میرپور جا رہی تھی، جہاں اس کے میکے کا گھر تھا جس کے ناہموار آنگن میں اُس نے اپنا بچپن گذارا تھا۔ راستہ میں وہ کئی بار بیہوش ہوئی اور جب ہم دریائے جہلم کو کشتی میں پار کرنے لگے تو جانے کس جذبہ کے تحت اس نے دریا میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔ میں سہمی سہمی نظروں سے پتا جی کی گود میں بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن وہ مجھ سے غافل معلوم ہوتی تھی۔ سفر کے دوران اس نے ایک بار بھی پیار بھری نظروں سے میری طرف نہ دیکھا اور جب ہم ننھیال کے مکان میں پہونچے تو وہ دہلیز ہی میں گر پڑی۔ ایک شور مچ گیا اور اس شور کو سُن کر اندر سے ایک عمر

کو گلے لگا لیا۔ اُس دن پہلی بار میں نے اپنے ماموں کو دیکھا تھا۔ وہ ایک عرصہ کے بعد گھر کی مزدوری مرمت کرانے کے لئے رخصت پر آیا تھا۔ اسے ایک مفرور کو پکڑنے کے سلسلے میں ہیڈ کانسٹبل بنا دیا گیا تھا اور سپرنٹنڈنٹ نے ایک سارٹیفکٹ بھی عطا کیا تھا۔ اُسی دن شاید کسی دشمن نے اس کی بہن کو بھائی کی موت کا تار دے دیا تھا۔ میں نے ماموں کو دیکھا کتنی لاپروائی تھی اُس کے کرخت اور سنجیدہ چہرے پر! جب اُسے تمام ماجرا سنایا گیا تو وہ ہنس دیا جیسے یہ روزمرہ کی بات تھی۔ جیسے ایسی خبریں تو اس کے متعلق ہر روز اُڑائی جاتی تھیں —— ہم وہاں ایک ماہ تک رہے، وہ مجھے بے حد پیار کرتا تھا، محکمے اور شہر میں اتنا بدنام انسان میرے لئے ایک دیوتا تھا اور جب ہم وہاں سے واپس ہوئے تو اُس کچے لیکن صاف مکان میں ایک دلہن آ چکی تھی۔ میرے ماموں نے بیاہ کر لیا تھا اور برات میں مجھے بھی ساتھ لے گیا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے وہ پہاڑی گاؤں وہ اُس کے سرسبز دھان کے کھیت، وہ رینگتا ہوا چھوٹا سا نالہ اور وہ ڈولی جس میں مجھے بھی ممانی کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا تھا۔ جب ہم وہاں سے واپس ہونے لگے تو میں نے آنے سے انکار کر دیا اور ماموں کے ساتھ چمٹ گیا۔ مجھے روتے ہوئے ہی خچر پر چڑھا دیا گیا اور خچر تنگ پہاڑی راستے پر چلنے لگا۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا اور اونچے نیچے راستے کے موڑ ہمیں دور لئے جا رہے تھے۔

بہت عرصہ تک مجھے ماموں کا بڑا سا طرّہ اور ممانی کا گورا گورا کھلا ہوا چہرہ یاد آتا رہا۔ پھر دو سال کے بعد میں اپنی ماں کے ساتھ ماموں کے ہاں گیا۔ ماموں ان دنوں کوٹلی کے تھانہ میں تعینات تھا، ممانی امید

سے تھی۔ ماں سارا دن گھر کے کام کاج میں لگی رہتی اور میں قریب ہی پہاڑ کی ڈھلوان میں بہتے ہوئے نالے میں سنگریزوں کے ساتھ کھیلتا رہتا یا کبھی شام کو ٹٹو پر چڑھ کر شہر کے باہر سڑک پر گھومنے نکل جاتا۔ ماموں نے میرے لئے ایک چھوٹا سا ٹٹو خرید لیا تھا اور مجھے وہ بہت عزیز تھا۔ تین ماہ کے بعد ماموں کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ بڑا خوبصورت ننھا سا بچہ تھا وہ میرا چھوٹا بھائی پرکاش اُسے خاص طور پر پیار کرتا تھا اور ہر وقت ممانی کی چارپائی کے گرد گھومتا رہتا تھا —— ممانی بیمار ہی رہی وہ صحتیاب نہ ہو سکی۔ لوگ کہتے تھے کہ اُسے پرسوت کا بخار ہو گیا تھا۔ اُن دنوں مجھے اس خطرناک بیماری کا علم نہ تھا لیکن آج میں بخوبی جانتا ہوں اُس کے نتائج۔ کچھ سال پہلے مجھے سینے ٹوریم اور پاگل خانے میں جا کر ایک سکون کا احساس ہوا کرتا تھا میں نے کتنا ہی عرصہ زندگی کے ان پامال شدہ، گلستانوں کو دیکھنے میں گذارا ہے "سینے ٹوریم" افسانہ میری انہی دنوں کی تخلیق ہے۔ ماں نے دل و جان سے ممانی کی خدمت کی۔ اُسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ تپ دق کے ایک مریض کی تیمارداری کر رہی ہے اور اُسے احتیاط برتنی چاہئے۔ وہ اس کے بستر میں بیٹھ کر اُس کے نڈھال جسم کو دباتی اور کبھی کبھی اس کے زرد چہرے کو چوم بھی لیتی جس پر ناامیدی کے گہرے اثرات اُبھر رہے تھے۔ دو سال ہوئے جب ماں بار بار بخار میں مبتلا ہو جاتی تھی تو میں اکثر سوچا کرتا کہ کہیں اُسے دق تو نہیں ہو گئی، اتنے دنوں کے خوابیدہ اثرات شاید جاگ پڑے ہوں اور کتنا ہی عرصہ میں ڈاکٹروں اور حکیموں کی تشخیص کو غلط سمجھتا رہا۔

ایک شام جب میں ٹٹو پر چڑھ کر نالے کے پتھروں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا تو نیچے گر پڑا اور ایک تیز نکیلا پتھر میرے دائیں ابرو میں

گھس گیا۔ میرے تمام کپڑے لہو سے تر ہو گئے اور جب میں اس حالت میں گھر پہنچا تو ممانی آخری سانس لے رہی تھی اُس کا زرد چہرہ بالکل مرجھا گیا تھا اور آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ ماں نے میری طرف دیکھا لیکن اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے ہاتھوں میں کپکپی تھی۔ ماموں نے میرے زخم پر پٹی باندھی۔ آدھ ایک گھنٹہ کے اندر ممانی ختم ہو گئی ——

اب بھی کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے دائیں ابرو کے زخم کا نشان نظر آتا ہے تو میری نظروں کے سامنے کوٹلی کا شہر گھوم جاتا ہے اور ایک کچے مکان میں چارپائی پر پڑی ہوئی مرتے دم تک ہنسنے کی کوشش میں مصروف ممانی اور خون بھرے تھوک کو صاف کرتی ہوئی میری ماں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میرے اَبرو کا زخم پھر کھل گیا ہے اور اس میں سے خون نکل کر کوٹلی کے نالے میں حل ہو رہا ہے —— لیکن اب تو اس میں صرف خون بہتا ہوگا، پانی تو کب کا سوکھ چکا ہوگا۔ معصوموں کا خون، بچوں کا خون، دوشیزاؤں کی عصمت کا خون اور شہر کے گرد پھیلی ہوئی کھائیاں بلوائیوں کی گولیوں سے گونجتی ہوں گی اور اندھیرے کی گہری غاروں میں دبکی نڈھال، انسانیت خون تھوک رہی ہوگی؟

ممانی کی موت کے بعد ماں کتنا ہی عرصہ خاموش، سنجیدہ اور اُداس رہی بیٹھے بیٹھے وہ اکثر رونے لگ جاتی اور ممانی کی باتیں لے بیٹھتی۔ اس کی سُندرتا اُس کے نیک اطوار اور اُس کے سلیقے کی باتیں۔ اور پھر کافی عرصہ گذر جانے کے بعد اس کی توجہ ایک اور طرف منعطف ہو گئی۔ اب وہ برت رکھتی۔ اور دیوتاؤں سے پرارتھنا کرتی کہ اس کے بھائی کا گھر دوبارہ بس جائے میں نے اُسے کئی بار سمادھوں اور قبروں پر پھول چڑھاتے اور دیئے جلاتے

ہوتے دیکھا۔ کئی بار رات کو جاگ کر وہ کسی سوچ میں ڈوب جاتی اور پہروں تک اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتی۔ اُسے اپنے اور اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی اور اس طرف سے غافل تھی وہ۔ اپنی خوراک اور اپنے علاج سے وہ بے توجہی برتتی تھی، اُسے صرف اپنے بھائی کی فکر تھی جس نے بچپن میں اُسے بے حد رُلایا تھا اور پھر اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ شاید یہ اس کی طویل غیر حاضری کا نتیجہ تھا کہ اب ماموں اُس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے لئے دنیا کی سب سے اہم اور قیمتی چیز اس کا بھائی تھا۔

میں ان دنوں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا۔ جب ماموں کی دوسری شادی ہوئی۔ ایک طویل عرصہ اس نے مجرّد رہ کر گزار دیا تھا۔ اُن دنوں میری اپنی ذہنی اُلجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ محبت اور عورت میرے خیالات کے محور تھے اور مجھے جس بھی عورت سے واسطہ پڑتا وہ میرے معیار پر پوری نہ اُترتی اور رفتہ رفتہ میں اس سے بیزار ہو جاتا۔ انہی دنوں میری نئی ممانی آئی۔ جانے کیوں مجھے وہ پہلے پہل پسند نہ آئی لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب مجھے گرمیوں کی چھٹیوں میں ماموں کے پاس جانا پڑا تو میری رائے بدل گئی۔ اس میں کچھ باتیں عام عورتوں جیسی نہ تھیں۔ اس میں کچھ انفرادیت تھی اور مجھے انفرادیت اچھی لگتی ہے۔ میں ایک عام قسم کے انسان میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ ایک بار کسی تفتیش کے سلسلے میں ماموں، بڑا ٹلہ گئے۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ یہ چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ایک بھیانک اور کرخت منظر کا حامل تھا۔ خشک اور تپتی ہوئی چٹانیں اور اُن بڑی بڑی چٹانوں پر گھوڑوں، خچروں اور لوگوں کے مسلسل گذرتے رہنے سے چمکتی اور بل کھاتی ہوئی سفید لکیریں جیسے کئی

سانپ اُن کے گرد لپٹ کر اپنا زہر ان میں نچوڑ رہے ہوں۔ قریب ہی ایک بہت بڑے پاٹ والا نالہ تھا جس میں صرف چمکتی ہوئی سفید ریت تھی پانی نہیں۔ وہاں کے بچھو بہت زہریلے تھے۔ سرِ شام ہی لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر چڑھ جاتے اور پھر کسی خاص مجبوری کے کارن ہی زمین پر پاؤں دھرتے۔ راستوں، گھر کی چھتوں اور دیواروں پر بچھو اپنا ڈنک موڑے پھرتے رہتے تھے ——— میں اکثر یہ سوچ کر حیران ہوتا کہ پنجابی لٹریچر کی اتنی بڑی تخلیق اس ماحول میں کیسے کی گئی تھی "سیف الملوک" یہیں لکھا گیا تھا۔ محمد شاہ یہیں کا رہنے والا تھا۔ اُس کے خاندان کے آدمی ابھی تک اس گاؤں میں رہتے تھے اور شام کے دھندلکوں اور صبح کے ننگے اُجالوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر گھومتے ہوئے چرواہے "سیف الملوک" کے بیت پُرسوز آوازمیں گاتے اور ساری فضا میں ایک نشہ سا بھر جاتا۔

"دل کہندا چل یار دے ملنے کی ادسوغات لے جائیے۔
"تن دا ماس، نیناں دیاں سیخاں بھُن کباب بنائیے"

میں بہت عرصہ یہ سطریں انھیں کی لے میں گنگنانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

"رل مل کسیاں شور مچایا رڑھ گئی ریت نمانی"

اور یہ سطر اب تک میرے ذہن کی گہرائیوں میں گونجتی ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نالوں اور ندیوں کا شور دراصل ریت کے ذروں کے آپس سے جدا ہو جانے کے قلق کی ترجمانی ہے۔ ندیاں اور جھرنے مستی بھرے گیت نہیں گاتے ریت کے ذروں کا دکھڑا سناتے ہیں جو بہہ رہے ہیں اور جنہیں اپنی منزل کی خبر نہیں۔ بڑا ٹلہ کے نالے کا پانی سوکھ چکا ہے اور ریت

کے ذرّے اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ اب انھیں سورج کی تیز کرنوں میں جھلسنا، تپنا اور جلنا ہوگا۔ زندگی کی آخری منزل شاید یہی ہے۔

تقریباً دو سال کے بعد بغیر کسی اطلاع کے ماموں ہمارے ہاں آیا۔ اس سے پہلے جب بھی وہ آتا اپنے آنے کی اطلاع ضرور دیتا۔ میں صبح سے دربدر پھرتا ہوا شام کو گھر واپس آیا۔ ان دنوں ذہنی لحاظ سے میں کچھ ایب نارمل سا بن گیا تھا۔ جب سے نجمہ مری تھی ایک عجیب قسم کی تلخی اور بیزاری میری طبیعت میں بھر گئی تھی۔ میں اس شام قبرستان سے واپس آیا تھا۔ وہ پورنیما کی رات تھی اور اس رات میں مردوں کی بستی میں ضرور جایا کرتا تھا —— جب میں گھر پہنچا تو ماں اور ماموں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور اُن کے چہرے اُداسی کی گرد سے اَٹے پڑے تھے۔ اس دن اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے اس سنجیدہ اور کرخت چہرے پر غم کی جھلک دیکھی تھی اور میں ٹھٹک گیا تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے اپنی اُداسی اور پریشانی کی وجہ نہ بتائی اور دوسرے دن وہ سویرے ہی واپس چلا گیا اور یہ کہہ گیا کہ اس کی تبدیلی بھدرواہ تھانہ میں ہوئی تھی اور چند روز تک چارج دے کر وہ دوبارہ ملنے آئے گا۔ مجھے اُس کے اس غیر معمولی رویے کا کارن جاننے کی کرید لگی رہی اور آخر میرے اصرار سے تنگ آکر ماں نے مجھے بتایا کہ ایک ہزار روپے کی رقم گم ہو گئی تھی اور چارج لینے والا دوسرا سب انسپکٹر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اگر وہ رقم ادا نہ کر سکا تو اس پر غبن کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا جائے گا۔ خود اس کے پاس اتنی رقم نہ تھی جہاں تک مجھے علم ہے اُس نے اپنی آمدنی میں سے کبھی ایک پیسہ تک نہ بچایا تھا۔

اور اب اُسے ایک ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ ماں نے اپنے گہنے اُس کے آگے ڈھیری کر دیئے تھے اور وہ انھیں لے کر واپس چلا گیا تھا۔ ماں نے اپنی پونجی اپنے بھائی کی تکلیف مٹانے کے لئے اُسے دے دی تھی۔ بہت عرصہ کے بعد پتاجی کو جانے کس طرح اس بات کا پتہ چل گیا۔ وہ دیر تک ناراض ہوتے رہے، ماں کو کوستے رہے اور ماں روتی رہی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے اپنا گھر اُجاڑا تھا، لیکن اس کے ساتھ اس نے اپنے بھائی کے گھر کو اُجڑنے سے بچا بھی تو لیا تھا اور جب وہ زیادہ ناراض ہونے لگے تو ماں نے کہہ دیا۔

"مجھے اس گھر سے زیادہ عزیز ہے اپنا بھائی"

اُس دن گھر میں جیسے ایک انقلاب سا آگیا تھا۔ ماں کی زندگی میں سمویا ہوا زہر جیسے ایک دم زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھا تھا۔ مجھے پہلی بار پتاجی پر غصہ آیا تھا۔ میں نے اپنی ماں کی دبی ہوئی، کراہتی ہوئی اور زہر بھری زندگی کی حمایت کی تھی، میں اس دن پہلی بار پتاجی سے گستاخی سے پیش آیا تھا —— میں خود زہریلے مادوں کی ترتیب سے بنا تھا میں اب دنیا کی ہر شے اور خود اپنی زندگی سے گستاخی برت رہا تھا۔ میں اپنی ماں کا بیٹا اور اپنے ماموں کا بھانجا تھا۔

میری اور ماموں کی آخری ملاقات بھدرواہ میں ہوئی۔ میں عرصہ سے اس علاقہ کو دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ میں نے وہاں کے جھرنوں کے گیت سنے، چوڑے چوڑے نالوں کے کناروں پر گھوما، میں نے کیلاش پربت کی چوٹیوں کو قریب سے دیکھا وہاں کی خوبصورتی سے متاثر ہوا اور کھلی جاتی ہوئی نسائیت کا بھی قریب سے مطالعہ کیا (میں نے عورتوں

کو سارا سارا دن وادی میں پھیلے کھیتوں میں کام کرتے دیکھا اور گھروں میں حقہ گڑگڑاتے، تاش کھیلتے اور افیون کھا کر فرش پر پڑے رہتے مردوں پر بھی میری نگاہیں پڑیں۔ میں نے وہاں جنت کے دلکش نظاروں کے ساتھ ہی ساتھ جہنم کے شعلوں کو بھی لپکتے ہوئے محسوس کیا۔ زندگی میں جنت اور جہنم کو سمو دیا گیا ہے۔ مختلف زاویوں سے دیکھ کر ہم تصور کر لیتے ہیں زندگی صرف جنت ہے یا صرف جہنم' دونوں کا امتزاج نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ پہلی بار تھی جب میں ماموں کے پاس جا کر اتنی جلد بیزار ہو گیا تھا۔ میرے تیکھے احساس نے اب مجھے زندگی کی تہوں کو کریدنے کی عادت ڈال دی تھی اور اس طرح میں ہر دلکش ماحول میں اپنے لئے تلخی اور بے اطمینان کے آثار پیدا کر لیتا تھا۔ جب میں کھدرواہ کے علاقے سے نکل آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں زندگی کے ایک ایسے دور سے گذر کر آیا تھا جہاں جنت اور جہنم کی حدیں ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئی تھیں میں چناب میں گھلے ہوئے دودھ کے ساتھ ساتھ بہتا رہا اور جھاگ کو تھپیڑوں سے ٹکراتے اور جھتے دیکھتا رہا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد میں ماموں کو کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ چناب کا یہ پانی جواب مجھے ڈھلان پر آسانی سے بہاتے لے جا رہا تھا پھر واپس نہ آنے دیگا۔

اس کے بعد میری زندگی میں غم اور دکھ کا دور آیا۔ میرے ذہن اور قلب میں گھلا ہوا زہر میری شخصیت میں ابھرا اور میرے نزدیک آنے والے ہر انسان نے مجھے گستاخ' اُجڈ اور سنکی کہہ کر پکارا۔ پھر یہ زہر میری تحریر میں بہہ نکلا اور میرے افسانے زہر کے انجکشن بن کر جنتا کے دماغوں کو سم آلود کرنے لگے مگر زہر میں کڑواپن نہیں تھا۔

اس میں کشمیر کے باغوں میں لگے پھلوں کا رس تھا، اس میں ہمالہ کی گود میں کھلے ہوئے پھولوں کی باس تھی، اس میں پگھلی ہوئی برف کی ٹھنڈک تھی۔ لوگ اُسے شوق سے پیتے تھے اور پی چکنے کے بعد پشیچا تاب کرتے تھے۔ عوام میرے افسانے پڑھتے تھے اور پڑھ چکنے کے بعد مجھے گالیاں دیتے تھے۔ لوگ بڑی چاہ سے مجھے ملنے آتے تھے اور دل میں حقارت کا جذبہ لئے واپس چلے جاتے تھے —— میری زندگی' میری ماں کی شخصیت بنتی جا رہی تھی۔ خوبصورت، گورا اور متناسب چہرہ۔ کالی گہری اور گھمبیر آنکھیں جن میں ہر لمحہ ایک سوال تھرکتا تھا اور میں اب ایک سوالیہ نشان بن کر دنیا کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

میں دیر تک اپنی ذاتی الجھنوں میں اُلجھا رہا۔ میرے ذاتی دُکھ سُکھ ایک عرصہ تک مجھے پریشان کئے رہے اور جب یہ بھیانک دور اپنے کلائیمکس پر پہونچ گیا، جب میری شخصیت کے تخریبی جذبے میرے فن پر چھانے لگے، جب نقادوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میرے افسانوں میں ایک بیمار ذہن کی جھلکیاں نظر آتی تھیں اور میرے فن میں کوئی تعمیری پہلو نہ تھا، جب میں نے تخریب کا یہ عمل خود اپنے جسم' اپنے ذہن اور اپنی ذات پر بھی کرنا شروع کر دیا تو ملک بھر میں تخریب کی آندھی جاگ اٹھی۔ اونچے اونچے قصر گرنے لگے، چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں پھکنے لگیں، گلیوں میں معصوموں کا خون بہنے لگا، فضا دھوئیں سے تاریک ہونے لگی اور آکاش یتیموں اور بے کسوں کی چیخوں سے پھٹنے لگا۔ مجھے کتنا سکون ہوا تھا ملک کی بربادی کا حال سُن کر جیسے اس تمام تخریب کا بانی میں تھا جیسے یہ لپکتے ہوئے شعلے میرے دل کو جھلستے

ہوئے شعلے تھے، جیسے یہ خون میری جوان آرزوؤں کا خون تھا، جیسے یہ چیخیں میری حسرتوں کے ماتم کی گونجیں تھیں۔ میں نے بیاس میں ایک بہت بڑا قافلہ غرق ہوتے ہوتے دیکھا، میں نے اسٹیشنوں کی فضا میں لاشوں کے سڑنے سے پھیلا ہوا تعفن سونگھا، میں نے گاڑی کے ڈبوں میں گولیوں کے نشانوں پر ہاتھ رکھے، میں نے انسانیت کے زخموں کو قریب سے دیکھا اُن کی کسک اور جلن کو محسوس کیا لیکن ان پر مرہم لگانے کی کوشش نہ کی، ایک لاپرواہ اور بے تعلق انسان کی طرح قریب سے گذر گیا۔

لیکن آج میری حالت اور ہے۔ آج مجھے اپنی ماں کے کھلے ہوئے زخموں سے بہتا ہوا خون نظر آرہا ہے، آج اس کی آنکھوں سے رستے ہوئے آنسو چمک رہے ہیں، آج اس کی زندگی کا سویا ہوا زہر ایک زندہ انسان کی طرح مجھے گھور رہا ہے۔ اس نے جس زہریلے مادے کی تخلیق کی تھی آج اُسے تریاق بننے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ آج کشمیر کی حسین وادیوں میں شعلے لپک رہے ہیں، پھول مرجھا گئے ہیں، چشمے سوکھ گئے ہیں اور میں نے اپنی کمزور باہیں پھیلا کر، اپنے کمزور ہاتھوں سے اُسے ان جھلستے ہوئے شعلوں سے باہر کھینچا ہے۔ اور وہ شعلوں سے باہر نکلتے وقت اپنے ذہن میں کچھ داغ لے آئی ہے۔ اب وہ داغ جلتے ہیں تو مجھے اِن دِیوں کی یاد آجاتی ہے جو کبھی کبھی گھر کو بھی جلا دیا کرتے ہیں اور میرا گھر میری زندگی ہے، شکستہ، نڈھال اور بیمار۔

جب ماں کشمیر سے یہاں آئی اس سے کچھ ماہ پہلے ماموں کوٹلی کے تھانہ میں تعینات کیا گیا تھا۔ وہی کوٹلی جہاں میری ماں نے بہت برس پہلے اپنی مدقوق بھابی کی خدمت کی تھی، جہاں میں نے اپنے دائیں ابرو

میں زخم کھایا تھا۔ آج وہاں لٹیروں نے زندگی کے تمام عناصر بکھیر دیئے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے میں Russell Haight رسل ہیگٹ ایک امریکن کا بیان پڑھ رہا تھا جو صرف تین ماہ میں ایک سپاہی سے بریگیڈیر جنرل بنا تھا اور جس نے جھنگڑ میں لٹیروں کی راہنمائی کی تھی۔ اُس نے لکھا تھا کہ جب پٹھان کوٹلی میں داخل ہوئے تو وہ اس کے قابو میں نہ رہے۔ وہ انھیں روک نہ سکا اور جو مظالم انھوں نے وہاں ڈھائے تھے اُسے خود انھیں بتلاتے شرم آتی تھی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے بازار کو جلایا اور جو سامان ملا اٹھا لیا، پھر وہ گھروں کی طرف مڑے۔ جو کچھ وہ نہ لے جا سکے اُسے انھوں نے جلا کر راکھ کر دیا۔ پھر جانوروں کی باری آئی اور سب سے آخر میں عورتوں کی۔ لٹیرے اُن میں سے خوبصورت عورتوں کو چنتے تھے اور انھیں اُٹھا کر لے جاتے تھے اور پشاور میں 'لال بی بی' کے نام سے بیچتے تھے ——— تمام رات وہاں ڈھول بجتے ہیں اور گولیاں چلائی جاتی ہیں اور شہر کے گرد پھیلے ہوئے غار اِن بھیانک آوازوں سے گونجتے ہیں اور ماموں کے متعلق مجھے اب تک کوئی خبر نہیں ملی۔

دن کے ایک بجے کے بعد ماں کے چہرے پر ایک خاص قسم کی تلخی اور اضطراب کے نشان اُبھرنے لگتے ہیں۔ اس کی کالی گھمبیر آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ باہر برآمدے میں گھومنے لگتی ہے پہلے آہستہ آہستہ چکر کاٹتی ہے اور پھر اُس کے قدموں میں آپ سے آپ ایک تندی اور تیزی آجاتی ہے۔ وہ بار بار نیچے گلی میں جھانکتی ہے۔ اور پوسٹ مین کو ڈاک تقسیم کرتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔ اور جب وہ میرے گھر کے سامنے سے گذرنے لگتا ہے تو اس کا دل گویا زور زور

سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اُس کی آنکھیں دئیوں کی طرح روشن ہو جاتی ہیں اور اس کے چہرے کا اضطراب تڑپن کی حد تک جا پہنچتا ہے اور جب پوسٹ مین لاپرواہی سے ڈیوڑھی پر لگی میرے نام کی سیاہ تختی کی طرف دیکھے بغیر آگے گزر جاتا ہے تو اس کی دھڑکن یک لخت جیسے رُک سی جاتی ہے، اس کی آنکھیں دھندلا سی جاتی ہیں، اس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے وہ ادھ مری سی ہو کر پلنگ پر آگرتی ہے اور پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے ہیں؟ وہ ہر روز مجھے اخبار پڑھ کر سنانے کو کہتی ہے اور صرف کشمیر کی ہی خبریں سنتی ہے اور خبریں سنتے وقت وہ یوں دکھائی دیتی ہے جیسے ایک بچہ مندر میں کسی مورتی کے سامنے عقیدت سے کھڑا ہو جاتے لیکن جب اُن خبروں میں اُسے اپنے بھائی کی کوئی خبر نہیں ملتی تو وہ مایوس ہو جاتی ہے، اُس کی عقیدت ختم ہو جاتی ہے اور بچہ جیسے بھگوان کی مورتی کا منہ چڑانے لگتا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی پرکاش ابھی کشمیر میں ہے وہ صرف ماموں کی خاطر وہاں ٹھہرا ہے۔ جب اُس کا خط آتا ہے تو ماں کا چہرہ پل بھر کے لئے کھِل اٹھتا ہے اور جب اس میں اُسے بڑا دَاس کی کوئی خبر نہیں ملتی تو کھلا ہوا چہرہ یوں جھلس جاتا ہے جیسے کسی نے اُسے شعلوں میں پھینک دیا ہو۔

اُس کے لئے صبح آنسوؤں کی چند بوندوں سے طلوع ہوتی ہے اور رات ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح گرتے آنسوؤں سے سلگ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ میں اُسے اکیلے نہیں بیٹھنے دیتا۔ تنہائی اس کی دشمن ہے۔ وہ اس دشمن کے واروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نے اُسے اکثر روتے دیکھا ہے رات کے اندھیرے میں اور دن کے اُجالے میں۔ میں ہر روز اُسے جھوٹی سچی خبریں سناتا ہوں۔ میں اُسے کہتا ہوں کہ اب لٹیروں کو

کشمیر کی وادیوں سے باہر نکالا جا رہا ہے اب اس میں سلگتے ہوئے شعلے بجھ رہے ہیں لیکن اُسے میرا اعتبار نہیں۔ میں اُسے ہند گورنمنٹ کے اعلان سناتا ہوں کہ وہ کشمیر کی ایک ایک انچ زمین لٹیروں سے واپس لیں گے لیکن اُسے سرکاری اعلان ڈھونگ نظر آتے ہیں۔ میں اس سے لیک سکسیس میں ہوتی ہوئی بحثوں کا ذکر کرتا ہوں لیکن اُسے اِن تماشائیوں پر بھروسہ نہیں، میں اس کے سامنے شیخ عبداللہ کے بیان پڑھتا ہوں لیکن اُن سے اُس کی تسلی نہیں ہوتی، میں اُسے پنڈت نہرو کی تقاریر کے اقتباسات دکھاتا ہوں لیکن انھیں وہ اپنی چھوٹی سمجھ کے باہر کی بات کہہ کر چپ ہو جاتی ہے اُسے یقین ہے کہ شعلے آخر بجھ جائیں گے کیونکہ اُس نے چولھے میں جلتی ہوئی آگ کو بجھتے دیکھا ہے اور بعض دفعہ اُسے جلانے میں اپنی آنکھوں سے آنسو بھی گرائے ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ سوکھے ہوئے غنچے پھر کھلیں گے، اُس نے گملوں میں اُگے پودوں پر پھولوں کے مرجھانے اور کھِلنے کا منظر دیکھا ہے وہ تسلیم کرتی ہے کہ آسمان میں چھائی ہوئی کالی گھٹائیں آخر چھٹ جائیں گی۔ اور آسمان صاف ہو جائے گا۔ لیکن وہ یہ بھی تو پوچھتی ہے کہ شعلوں کے بجھ جانے کے بعد ان میں جل کر راکھ ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچ دوبارہ کون بنائے گا۔ پودوں میں تازہ پھول کھلیں گے لیکن مرجھائے ہوئے پھولوں کی حسرت کا کیا بنے گا؟ آسمان سے گھٹائیں چھٹ جائیں گی لیکن شاید اس وقت تک چاند کے گہنانے کا وقت آ جائے ——— کشمیر سے لٹیروں کو نکال دیا جائے گا لیکن اُن کی گولیوں کا نشانہ بنے ہوئے لوگ ہمیں کیسے ملیں گے؟ یہ تو خدا کے بس کی بھی بات نہیں۔ یہ تو اس کی طاقت سے بھی باہر کا کام ہے میں پنڈت نہرو سے، مولانا آزاد سے، شیخ عبداللہ اور ملک کے

تمام مدبّروں اور ادیبوں سے نہایت عاجزی سے پوچھتا ہوں کہ ایک بیٹا ہونے کی حیثیت سے ایک پریشان اور نڈھال عورت کو جس کا بھائی شعلوں اور گولیوں کی زد میں ہے، جس کی بھابھی اپنے بچوں سمیت لٹیروں کے رحم وکرم پر ہے کیا کہہ کر تسلّی دوں۔ وہ ایک ان پڑھ دیہاتی عورت ہے دنیا کی سیاست کے پلٹوں کا اسے کوئی علم نہیں، تواریخ کو وہ انقلاب کے جلو میں بربادیوں کے طوفان کا گواہ نہیں سمجھتی۔ وہ ایک عام امن پسند ہندوستانی عورت ہے جس نے گڑیوں سے کھیلنے کی عمر سے لے کر اب تک اپنی زندگی گھر کی چار دیواری میں بسر کی ہے جس کے جسم پر سورج اور چاند نے بھی نگاہ نہیں ڈالی۔ وہ ایک عورت نہیں کشمیر کی تمام عورتوں کی ترجمان ہے وہ ملک کی تمام عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ میں اس کے دکھی دل کو کن الفاظ سے شانتی دوں، میں اس کے بہتے ہوئے گرم آنسوؤں کو کیسے پونچھوں، میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ اس کا بھائی زندہ ہے اور کشمیر کی وادیوں میں ناچتے ہوئے شعلے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔

میرا جنم دن نزدیک آ رہا ہے۔ میں تیرہ ۱۳ اپریل سنہ ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوا تھا وہ دن جو ہندوستان کی تواریخ میں ایک کبھی نہ بھول سکنے والی خونی داستان کا عنوان ہے۔ وہ دن جب جلیانوالہ باغ میں ہزاروں بے قصور انسانوں کا خون بہایا گیا تھا۔ میری زندگی بھی خون آلود ہے اور اس خون میں زہر کی ملاوٹ ہے۔ میرا ماموں بھی تیرہ ۱۳ اپریل کو ہی پیدا ہوا تھا اس کا اور میرا جنم دن ایک ہی ہے۔ ماں نے میرے جنم دن کو ہمیشہ اپنے بھائی کا جنم دن سمجھ کر خوشی سے منایا ہے۔ اور اب وہ دن نزدیک آ رہا ہے اور کشمیر کی حسین وادیاں شعلے اگل رہی ہیں۔ بیواؤں کے سینوں میں چتائیں

سلگ رہی ہیں اور دوشیزاؤں کے ماتھوں پر لٹی ہوئی عصمت کے داغ جل رہے ہیں۔ میں اس دن اپنی ماں سے کس لہجہ میں بات کروں گا اسے کیا کہہ کر تسلی دوں گا؟ مجھے یقین ہے کہ وہ آنسو جو ہر روز اس کی پلکوں میں تھرتھراتے ہیں اس دن سینے کی گہرائیوں میں ہی ابلیں گے۔ وہ اپنے بیٹے کے جنم دن پر آنسو بہانا ایک برا شگون سمجھے گی۔ اس کا بیٹا زہر کا ایک ڈھیر جسے پندرہ سال تک وہ اکٹھا کرتی رہی۔ میں اس کے جلتے ہوئے دل پر کونسا پھاہا رکھوں گا؟ وہ اس دن بھی پوسٹ مین کا انتظار کرے گی اور اس دن کی تلخی جانے کتنی شدید ہوگی؟ میں اس وقت اپنے گرد اندھیرے کی گہری تہیں گھنی ہوتی دیکھتا ہوں۔ مجھے اس وقت روشنی کی ایک کرن چاہیے۔ اندھیرے، گھٹن اور زہر کی کوکھ سے پیدا ہوئے انسان کو اس وقت نور کے ایک پلکے کی ضرورت ہے چاہے وہ مانگے ہی کا نور ہو۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی سے کوئی چیز نہیں مانگی اور اگر کبھی مانگی ہے تو اس نے انکار کی کبھی جرأت نہیں کی ——

اور آج میں ایک بھکاری کی طرح ہر دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے تیار ہوں ہر دہلیز پر ماتھا رگڑنے کو حاضر ہوں، مجھے نور کی ایک شعاع چاہیے، میں اسے بہت جلد لوٹا دوں گا، میں اس سے اپنی تاریک زندگی کو ایک لمحہ سے زیادہ روشن نہ کروں گا —— میں وعدہ کرتا ہوں۔

بُلاوا

تم نے مجھے کشمیر آنے کو لکھا ہے لیکن میں کیا کروں گا کشمیر آکر' ہری ہو شاداب وادیوں میں اپنے داغوں کی تپش لے کر کیسے آسکتا ہوں؟ میں یہ کیسے گوارا کرسکتا ہوں کہ چشمہ شاہی کے شیریں اور ٹھنڈے پانی کی نہر کے کنارے بیٹھ کر اپنے رِستے ہوئے ذہنی ناسوروں کو تکتا رہوں اور دیکھتے ہوئے پھولوں پر لرزتے شبنم کے قطروں میں اپنے آنسو ملاؤں۔ میں شاید کچھ غلط کہہ رہا ہوں میں بھول رہا ہوں کہ وہ شاداب وادیاں اب ویران ہوچکی ہیں۔ اُن میں سُندر سُندر جنگلی پھولوں کی جگہ شعلے سلگ رہے ہیں' چشموں کے میٹھے ٹھنڈے پانی میں خون کی ملاوٹ ہے' اُس کا ذائقہ تازہ خون سا ہے۔ پھولوں کے ایاغ اب زہر کے قطروں سے اَٹے پڑے ہیں' زہر جو ہر لمحہ اُن میں گرایا جارہا ہے ——— اور تم مجھے کشمیر آنے کو کہہ رہے ہو۔ تم میرے ماضی کے پردے پر دھندلی ہوچکی تصویروں میں رنگ بھرنے کی سعی کررہے ہو۔ تم میرے ادھ مرے جذبات کو نشتر سے ٹہوکے دے رہے ہو۔ تم اب ایک لیڈر بن گئے ہو نا اس لئے اور لیڈر کی ذات ایک عجیب قسم کا گورکھ دھندہ ہوتی ہے' ایک عجیب قسم کی پہیلی جسے ہر

کوئی نہیں سمجھ سکتا' ہر انسان حل نہیں کرسکتا۔

امتحانوں کے معاملے میں سٹرائیک کرانے پر کالج سے نکال دیا جانا' ذمہ دار حکومت حاصل کرنے کے لئے نظر بند رہنا' شخصی حکومت کے خلاف ان پڑھ عوام کے ذہنوں کو بھڑکانا اور کئی بار گرفتاری سے پہلے اپنا کام پورا کرلینے کے لئے ایک مجرم کی طرح اِدھر اُدھر چھپتے پھرنا۔ یہ بظاہر بے کار سرگرمیاں آخر تمھیں راس آہی گئیں۔ تم نے ریاست کی سیاست میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ حاصل کرلی تھی۔ تم نے اپنے ہم مذہبوں کے کوسنے سنے' ایک مسلمان سے زیادہ نیشلسٹ ہونے پر تمھیں گالیاں ملیں' تمھاری پرائیویٹ زندگی کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ تمھاری بہن کی شادی کے روز جب تم نے سب تیاریاں کرلی تھیں' جب صرف برات کی آمد کا انتظار کیا جارہا تھا۔ عین اس وقت لڑکے نے شادی سے انکار کردیا۔ خورشید نے نہیں ایک پارٹی نے' ایک گروہ نے ایک منظم جماعت نے تم سے انتقام لیا تھا۔ تمھاری تذلیل کی تھی' تمہیں گہری چوٹ پہنچائی تھی میں بھی اُس وقت تمھارے گھر میں موجود تھا۔ اس واقعہ کا اثر کتنا تباہ کن اور المناک تھا تمھاری بوڑھی والدہ دوسری صبح فوت ہوگئیں۔ وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکیں اور رضیہ بہن کو اُس دن شاید پہلی بار غشی کا دورہ پڑا تھا اُس کے ذہنی توازن کو پہلا جھٹکا لگا تھا اور اس طرح کے مسلسل کئی جھٹکوں نے آخر اُسے شادی اور محبت کے نام سے ہی متنفر کردیا۔ مجھے اب بھی یاد ہے۔ ایک بار تم میرا افسانہ سُن رہے تھے' رضیہ بہن بھی پاس بیٹھی تھی۔ وہ دیر تک انہماک سے افسانہ سنتی رہی۔ اس نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا مگر ایک بار جب میری نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھیں تو

وہ زرد ہو رہا تھا۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ کہانی کا کلائمیکس نزدیک آ رہا تھا، میں نے سوچا چند لمحوں میں پڑھ ڈالوں گا اور میں پڑھتا رہا۔ تم میز پر سر ٹیکے سن رہے تھے۔ اچانک رضیہ مجھ پر جھپٹی اور میرے ہاتھوں سے کاغذ چھین کر انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم بھی گھبرا گئے اور میں سہم گیا اس کا چہرہ زیادہ زرد ہو گیا۔ وہ ایک وحشیانہ انداز سے ہنسی اور پھر لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی، اس افسانے میں تمھاری ہی ایک ناکام محبت کا ذکر تھا۔ تمھارے گھر کی شکستگی، تمھاری ماں کی موت اور رضیہ کی کھوکھلی ہو چکی زندگی نے تمھارے ذہن میں آگ بھر دی۔ وہ آگ سلگی، بھڑکی اس نے تمھیں جھلسایا، تپایا، تمھارے عزم میں سختی پیدا کی اور تمھیں ایک پکا نیشنلسٹ مسلمان بنا دیا۔ میں ابھی تک تلخ افسانے لکھنے والا ایک احساس ادیب ہوں۔ ایک بچہ جو خود ساختہ کھلونوں سے دل بہلاتا ہے اور تم ایک لیڈر ایک راہ نما، ایک ریفارمر اور آزادی کی جنگ میں لڑنے والے ایک سپاہی۔ ہم دونوں کے افسانوں کے کلائمیکس کتنے مختلف ہیں!

تم نے لکھا ہے کہ کشمیر میں عنقریب ریفرنیڈم ہونے والا ہے کیونکہ سکورٹی کونسل کی بحثوں سے فی الحال یہی نتیجہ نکلا ہے۔ لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک کو چن لیں۔ کسی ایک سے سماجی اقتصادی اور سیاسی بندھن جوڑ لیں۔ جنتا اپنے لئے خود سوچے اور اپنا مستقبل بنانے کی ذمہ داری ہے۔ بڑا اونچا نظریہ ہے ملک کو پاکستان اور ہندوستان میں بانٹنا بھی تو اس نظریے کا نتیجہ تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے ہنسی آتی ہے اُن لوگوں پر جو ایک جسم کو دو ٹکڑوں میں کاٹتے ہیں اور پھر خون کی دھارے نکلنے پر

حیران ہوتے ہیں، جو ایک عظیم اور صدیوں کی پرانی عمارت کو تقسیم تو کرتے ہیں لیکن چھتیں گرنے اور دیواریں بیٹھنے پر شور مچاتے ہیں جو سست رفتار سے بہتے ہوئے ایک دریا میں بند لگا کر اُس کے پانی کو بانٹنا چاہتے ہیں۔ اور پھر کناروں پر آباد جھونپڑوں کے بہہ جانے پر افسوس کرتے ہیں۔ انسان کی سرشت میں سموئی ہوئی ان دو متضاد خاصیتوں میں سے کونسی خاصیت زیادہ اہم ہے، زیادہ تعمیری ہے، زیادہ مفید ہے جسم کے ٹکڑے کرنا، عمارت کو بانٹنا، دریا میں بند لگانا یا اُن کے نتائج پر حیرت ظاہر کرنا، شور مچانا اور افسوس کرنا؟ انسان کی یہ دونوں خاصیتیں اپنا اپنا اظہار کرتی رہیں گی۔ وہ کبھی وحدت دیکھنا گوارا نہ کرے گا، وہ جزو کو کبھی کل میں مدغم ہوتے نہ دیکھ سکے گا، وہ ذرے کا صحرا میں فنا ہونا برداشت نہ کرے گا۔ قطرے اور دریا کی، ذرے اور صحرا کی جزو اور کل کی یہ جنگ ابد تک جاری رہے گی اور انسان اپنے نظریوں کو سچا اور مضبوط ثابت کرنے کے لئے قدرت کے اصولوں کو جھٹلائے گا، خون بہائے گا آگ اگلے گا، درندہ بنے گا اور دیو کی طرح چنگھاڑے گا۔

تم نے کشمیر آنے کی دعوت دے کر ان جانے میں میرے زخموں کو کرید ڈالا ہے۔ میری ذات کے گرد چھایا ہوا ماضی کا گھنا اندھیرا ہلکا ہونے لگا ہے۔ کچھ مناظر ابھرنے لگے ہیں اور میں انھیں پہچان رہا ہوں۔

میں جس محلّے میں رہتا تھا وہ خالص مسلمانوں کا محلّہ تھا میرے گھر کی ہر دیوار کسی مسلم گھرانے کی دیوار سے ملتی تھی۔ ایک مدت سے ہمارا خاندان اس گھر میں رہتا آیا تھا۔ آپس میں ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے، ہم دکھ اور سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ عورتوں کا آپس میں ماؤں اور بہنوں جیسا پیار تھا اور میں نے کبھی یہ محسوس نہ کیا تھا کہ ہم مسلمانوں کے محلے میں رہ رہے تھے اور کبھی ایسا وقت بھی

آئے گا جب ہم وہاں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ وہ غالباً جنم اشٹمی کا دن تھا، وہ دن جب سولہ کلا کیوں ان بھگوان کرشن نے جنم لیا تھا، ظلم اور جہالت کے گہرے اندھیر میں ایک کوندا لپکا تھا اور اس کی چوندھیا دینے والی روشنی نے سارے سنسار میں اجالا کر دیا تھا۔ اس دن کو منانے کے لئے ہندوؤں نے ایک جلوس نکالا تھا ایک مسلم بازار میں سے گذرتے ہوئے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سر پھٹول ہوئی، کئی دکانیں لوٹی گئیں اور کئی آدمی زخمی ہوئے فوج بلائی گئی، کرفیو نافذ ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کا شور و غوغا ایک بھیانک خاموشی تلے دب گیا۔ کئی ہندو دوستوں نے کہا کہ مجھے رات کو اپنے گھر نہ رہنا چاہئے بلکہ کسی ہندو محلے میں چلا جانا چاہئے۔ یہاں تک کہ دو ایک دوست مجھے ساتھ لیجانے کے لئے میرے گھر بھی آئے لیکن میں نے جانے سے انکار کر دیا اور وہ مایوس ہو کر ڈرتے ڈرتے، کانپتے کانپتے گلیوں کے موڑوں میں کھو گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ لوگ اپنی اپنی چھتوں پر پڑے تھے کئی بار رات کا مردہ سینہ 'اللہ ہو اکبر' اور 'ہر ہر مہا دیو' کے نعروں سے زخمی ہو جاتا اس وقت نیند ٹوٹ جاتی، دل ڈوبنے لگتا، گلی میں سے گذرنے والے سپاہی کے قدموں کی آہٹ سے بھی خوف آتا اور میں کئی بار خود کو مطمئن کرنے کے لئے نیچے گلی میں جھانکتا میرے ہمسائے میں رہنے والے لوگ اپنی اپنی چھتوں پر آرام سے لیٹے تھے گو سوئے نہیں تھے۔ نیند ایسے بھرے ہوئے ماحول میں کہاں قریب آتی ہے۔ لیکن ان میں کوئی جوش نہ تھا، کوئی ہلچل نہ تھی۔ وہ رات کے ساکن سناٹے کی طرح بے جان تھے۔ میں نے ایک بار نہیں کئی بار دیکھا۔ "نوجوان" لڑکے اپنی چھت کی منڈیر پر بیٹھے تھے اور اُن کی نگاہیں میرے مکان کی ڈیوڑھی پر جمی تھیں۔ جو کبھی کبھی

ساری سنسان اور خاموش گلی کا بھی جائزہ لے لیتی تھیں۔ مجھے کئی دفعہ خیال آیا میں اُن سے پوچھوں وہ کیوں اب تک جاگ رہے تھے اور ننگی تلواریں پکڑے بیٹھے تھے لیکن یوں ہی کچھ جرأت نہ ہوئی، شاید یہ ماحول کے بھاری پن کا نتیجہ تھا۔ دل کو یہ کہہ کر سمجھاتا رہا کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے جاگ رہے ہوں گے ——— اور مجھے دوسری صبح پتہ لگا تھا کہ وہ صرف میری خاطر رات بھر جاگتے رہے تھے۔ انھوں نے کہیں سے سُنا تھا کہ کچھ جوشیلے لڑکے رات کو میرے مکان میں آگ لگانے اور مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے انھوں نے مجھ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ میں فضول فکر کرتا رہوں گا اور بے چین ہوں گا۔ وہ خود ساری رات جاگ کر میرے مکان کا پہرہ دیتے رہے وہ دونوں سگے بھائی تھے؛ اسحاق اور عزیز۔ وہ دونوں درزی کا کام کرتے تھے اور شہر کے بہت اچھے کاریگر خیال کئے جاتے تھے اسحاق وہ خوبصورت نوجوان مجھے بہت ہی اچھا لگتا تھا' ہمارا کام وہی کرتا تھا اور گھر میں آزادی سے آجا سکتا تھا ——— میں نے سنا ہے پچھلے سال اکتوبر میں جب کچھ مسلمان پاکستان جانے پر بضد ہو گئے اور کسی طرح بھی رکنے پر رضامند نہ ہوئے تو انھیں بحفاظت شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ راستے میں جانے کیسے کچھ غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا اور اسحاق مارا گیا۔ گذشتہ سال میں سمجھتا ہوں ہمارے ملک کی تواریخ میں غنڈوں کا سال کہلائے گا ۱۹۴۷ء میں انسانی ذہنوں پر غنڈوں کی حکومت تھی۔ دھرتی نے جانے کیسے اتنے غنڈوں کو جنم دے دیا تھا ——— مجھے اس خبر پر نو دس ماہ گذر جانے کے بعد بھی یقین نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ خوبصورت نوجوان ہرگز ہرگز موت کے قابل نہ تھا' وہ پانچوں وقت نماز پڑھنے والا ایک مسلمان

جو اپنے ہمسائے کو بچانے کے لئے اپنے ہم مذہبوں کے خلاف تلوار اٹھانے پر آمادہ ہو سکتا تھا، مر نہیں سکتا۔ اس کے چہرے کی پاکیزگی، آنکھوں کی چمک اور روح کی عظمت اب بھی زندہ ہے اور مجھے کہہ رہی ہے بخشی صاحب اس عید پر میں آپ کے ہاں کھانا کھاؤں گا اس راکھی پر کملا سے راکھی بندھوانے آؤں گا، آپ کو اعتراض تو نہیں۔ آپ امیر ہوتے ہوئے بھی ایک انسان ہیں۔ میں ایک انسان تھا اور وہ محض ایک مزدور۔ ایک درزی۔ انسانیت کو سنوارنے والا ایک ادنیٰ کاریگر، جو کپڑے کو کانٹ چھانٹ کر اس میں ایک جاذبیت، ایک کشش، ایک نزاکت اور ایک زندگی بھر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا سلا ہوا سوٹ کئی دنوں سے سامنے ہنگر پر ٹنگا ہوا ہے اس پر گرد جم رہی ہے لیکن میں اسے ایک بار بھی پہننے کی جرأت نہیں کر سکا مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے انسان نے انسانیت کا لباس اتار دیا ہے اور درزی دور کھڑا اس کی اس وقتی حماقت پر ہنس رہا ہے، اس کی ہنسی میں زہر نہیں، تلخی نہیں، طنز نہیں ایک شیرینی ہے اور عفو کا جذبہ ہے

آج ایک چھوٹی سی لڑکی کی مدھم مدھم سی شبیہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ جو میرے معصوم بچپن کی معصوم ساتھی تھی۔ پھر میں والد صاحب کی ملازمت کے سلسلہ میں پونچھ چلا گیا۔ اس کے بعد حصول تعلیم کے لئے ریاست سے باہر رہا اور جب ایک بار میں کالج کے کچھ عرصہ بند رہنے پر گھر آیا تو ایک عجیب حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میں ایک دن صبح اٹھ کر یوں ہی آئینے کے سامنے کھڑا کچھ گنگنا رہا تھا کہ اچانک میری نگاہیں سامنے کے مکان کی طرف اٹھیں کمرہ میں ایک خوبصورت دوشیزہ کھڑی تھی جو میرے ادھر دیکھنے سے پہلے شاید میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں اٹھتے

ہی نور کی ایک ہلکی سی لکیر لرزی اور چند لمحوں کے بعد طویل ہوتے ہوتے ایک منور نقطے پر پہنچ کر رک گئی ایک نقطہ جس میں ستاروں کی جگمگاہٹ، چاند کی برودت اور سورج کی حرارت تھی۔ میں اپنے سامنے گورے رنگ کی ایک چھوٹی سی لڑکی دیکھنے لگا بسلے اشیخ محمد اسمٰعیل کی لڑکی، جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور جب میں نے دوسری بار سامنے دیکھا تو وہ وہاں موجود نہ تھی شاید مجھے پہچان کر وہاں سے جا چکی تھی اور میرے ذہن میں اپنا ایک مستقل نقش مرتسم کر گئی تھی اور اس دوپہر کو میں پلنگ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا جب ایک گیت کے رس بھرے بول میرے کانوں میں امرت ٹپکانے لگے۔ کتنی پرسوز آواز تھی کم بخت کی جیسے دیپک کی تو راگنی گنگنانے لگے۔

اب راجہ بنے مورے بالم وہ دن بھول گئے،

جیسے وہ مجھے میرا بچپن یاد کرا رہی تھی۔ میری شخصیت میں سوئے ہوئے اس شریر لڑکے کو جگا رہی تھی جو کبھی اس کی گڑیاں چھین لایا کرتا تھا۔ اس کے کھلونے توڑ دیتا تھا۔ اس کے گھروندوں کو مسمار کر دیتا تھا، اسے پیٹا کرتا تھا اور اس کی دائم المریض ماں سے پیار بھری گالیاں کھایا کرتا تھا۔ کتنا سنگیت تھا اس کی گالیوں میں۔ وہ لڑکا آخر جاگ پڑا لیکن اس کی ساتھی پردے کے پیچھے چھپ گئی۔ وہ اس کے قریب جلد نہ پہنچ سکا اور کچھ دنوں کے بعد جب وہ مایوس ہو گیا تو پردہ جیسے ایک دم اٹھ گیا۔ بچپن کے دو ساتھی یکلخت ایک اونچی دیوار پھلانگ کر جوانی کے صحن میں آدھمکے۔ جہاں چاندنی ادھ کھلے غنچوں سے کھیل رہی تھی جہاں شبنم کی بوندیں غیر محسوس طور پر کلیوں کو چوم رہی تھیں اور فضا میں ایک نشہ سا تیر رہا تھا۔ کالج کھل گیا

لیکن ان کنول جیسی شفاف آنکھوں نے مجھے بہت عرصہ تک جانے کی اجازت نہ دی۔

میرے وہاں جانے کے شاید تیسرے دن شیخ صاحب نے نوکر کے ہاتھ مجھ سے کچھ رسالے منگوا بھیجے تھے۔ ایک دو دن کے بعد وہ لوٹا دیئے گئے۔ اور دوسرے رسالے منگوائے گئے اور پھر رفتہ رفتہ اس لین دین میں شیخ صاحب کا نام اڑ گیا صرف رسالے منگوائے جاتے اور پڑھ کر واپس کر دیئے جاتے اور بعض دفعہ کوئی ورق اڑا بھی لیا جاتا یا کسی شعر پر سرخ پنسل سے گہرے گہرے نشان کر دیئے جاتے جیسے زندگی کی تاریک راہوں پر دکھتے ہوئے سنگِ میل گاڑے جا رہے ہوں۔ صبح نور کی ہلکی شعاعیں ترنم لے کر میرے پاس آتیں اور شام کو اندھیرے کی پہلی تہہ میں لپٹے ہوئے گیت مجھ تک پہنچتے۔ اور پھر کبھی کبھی کھڑکی کی اوٹ سے ایک روشن چہرہ مجھے نظر آتا ایک ستارہ جو آسمان کی بلندیوں میں تھرتھراتا ہو، ایک کنول جو ڈل کے نیلے پانی میں ڈولتا ہو۔ آہ! وہ گورا متناسب چہرہ اور نشہ سے بھرپور آنکھیں، وہ روشنی اور حسن کا ایک مینار۔ وہ تنگ گلی کا مختصر سا فاصلہ ایک خلیج، ایک کھائی، ایک خندق۔ اس طرف سلمٰے ایک مسلمان لڑکی اور ادھر میں ایک برہمن النسل نوجوان اور بیچ میں روایات اور اختلافات کا ایک کھولتا ہوا سمندر جس نے کسی بھی باہمت تیراک کو صحیح و سالم ساحل تک نہیں پہنچنے دیا۔

ابھی کل میں یونہی مختلف رسائل کے سالنامے نکال کر دیکھ رہا تھا "ہمایوں" کے سال ۳۶ء کا سالنامہ نظر سے گذرا پہلے صفحہ کی پیشانی پر پنسل سے لکھا تھا۔

وہ بجلیاں قابلِ پرستش آشیانے کو راکھ کر دیں
کہ ذوقِ پرواز کا مخالف قفس سے بڑھ کر ہے آشیانہ

اور جیسے ایک تیز روشنی سے میری آنکھیں چوندھیا گئیں۔ آنکھوں نے ایک لمحے کے تجسس کے بعد اس طرزِ تحریر کو پہچان لیا۔ سلمٰے کی ہی تحریر تھی۔ سلمٰے جس کے خطوں کا بنڈل پچھلے سال میں نے غصہ میں آ کر جلا ڈالا تھا اس کی آخری یاد کو مٹانے کی کوشش کی تھی مگر اب جیسے خطوں کی سرد راکھ ایک شعلہ بن کر میری طرف آن لپکی تھی اور اس شعر کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نشتر بن کر چبھ گیا۔ میں جلبلا کر راہ اٹھا۔ آشیانے میں رہنے والے معصوم پرندوں کو اڑنے سے پہلے اپنے گھونسلوں کے ٹوٹے ہوئے تنکے بھی پرواز میں حائل دیواریں نظر آتی ہیں۔ اور وہ بجلیوں کو پوجنے لگتے ہیں اور بجلیوں کے پجاری اپنے گھروندے خاک کروا سکتے ہیں قوت پرواز حاصل نہیں کر سکتے۔ اس نے مجھے اپنا جیون ساتھی بننے کے لئے کہا لیکن میں ایسا کرنے کی جرأت نہ کر سکا، ہم دونوں کے درمیان کھولتا ہوا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا اور میں سلمٰے کو حاصل زندگی سمجھتے ہوئے حاصل نہ کر سکا

اختر کا نام تمہیں یاد ہو گا، وہی اختر جس نے ستی چوک کے عین درمیان کھڑے ہو کر اپنے سینے میں گولی کھائی تھی اور خون میں لت پت ہو کر نیچے گر پڑا تھا۔ اُسے اٹھانے کے لئے کوئی آدمی نزدیک نہ آیا تھا لوگ نالیوں میں چھپتے پھرتے تھے، تنگ گلیوں میں ڈری ہوئی بھیڑوں کی طرح بھاگ رہے تھے اور پولیس کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے اس وقت دوڑ کر میں اس کے قریب پہونچا اور پھر فوراً ہی تم مجھے بچانے کے لئے جانے کہاں سے آ گئے۔ زندگی کے ہر خوفناک حادثہ میں تم میری

مدد کو جانے کہاں سے آجایا کرتے ہو؟ ہم دونوں نے اُسے اٹھایا لیکن گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ زندگی کا آخری خونی کھیل ختم کر چکا تھا۔ چند دنوں کے بعد جب اس معاملہ کی تحقیقات ہوئی اور وزیر اعظم خود موقع پر پہنچے تو تم نے انھیں سوکھے ہوئے خون کی تہیں دکھائیں جو پولیس والوں کے دھو دینے کی کوشش کے باوجود بھی سڑک پر جمی رہی تھیں۔ وہ اختر کا خون تھا اور اختر سلمٰی کا بھائی تھا ۔ سلمٰی میرے بچپن کی ساتھی تھی۔ اس شام کو جب ہم اسپتال گئے تو وارڈ میں مسلمان زخمیوں کی دیکھ بھال ہندو کر رہے تھے اور ہندو زخمیوں کو مسلمان پانی دے رہے تھے۔ ایکتا کا کتنا عظیم نظارہ تھا وہ! مذہب کے نام پر کٹ مرنے والے لوگوں نے اس دن ایک صف میں کھڑے ہو کر گولیاں کھائی تھیں۔ روٹی کے خیال نے انھیں ایک مشترکہ محاذ پر کھڑا کر دیا تھا۔ روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر ہندو اور مسلمان ہاتھ میں ہاتھ دئے شہید ہوئے تھے۔ اس حادثہ کے بعد کتنا ہی عرصہ شہر کی فضا میں شانتی اور امن کا نشہ چھایا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب ہندو اور مسلمان ہمیشہ کے لئے آپس میں گھل گئے تھے۔ اب شدید سے شدید جھٹکے بھی انھیں الگ نہ کر سکیں گے۔ مرنے والوں کے خون نے ان میں ایک اٹوٹ رشتہ پیدا کر دیا تھا۔ اس خونی واقعہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان سب شہیدوں کا جلوس نکالا جائے اور انھیں ایک مشترکہ جگہ میں جلایا اور دفنایا جائے اور ان پر سمادھیں اور مقبرے بنائے جائیں۔ جلوس نکالا گیا، سمادھیں اور مقبرے بنائے گئے اور ہر سال ۱۲/اسوج کو شہیدوں کا دن منایا جانے لگا۔ شیخ اسمٰعیل کو اپنے جوان بیٹے کی موت کا رنج ضرور تھا لیکن انھیں اس بات کا فخر تھا کہ جو کام بڑے سے بڑا لیڈر نہ کر سکا تھا

وہ کام اُن کے بیٹے نے اپنی جان دے کر پورا کر دیا تھا۔ ہندو مسلم کا اتحاد بھی ایک قابل یادگار دور تھا ہماری ریاست میں اور اب ان سمادھوں اور مقبروں پر کوئی پھول نہیں چڑھاتا، دیا نہیں جلاتا اور اُن کا طواف کرنے کو رہ گئی ہیں سورج کی آخری زرد کرنیں جو اندھیرے کا پیام ہیں۔ ماضی کا اندھیرا جس میں ہر روشن لکیر تحلیل ہو جاتی ہے۔

آخری بار جب میں جموں گیا تو سلمٰی بیمار تھی اُسے بہت دنوں سے بخار آ رہا تھا۔ اس کی چارپائی کھڑکی کے ساتھ لگی تھی۔ میں نے پہلی بار جب اُسے اس حالت میں دیکھا تو تڑپ اٹھا اس کی زندگی کا چراغ جل جل کر تھک چکا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کی، اسی دن پہلی بار اس نے مجھے اس طرح نمستے کی تھی۔ جیسے دور کسی سفر پر جاتے ہوئے وہ مجھے الوداع کہہ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں کے کنولوں میں ایک حسرت سلگ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی جیسے اس کے سامنے میں نہیں اس کے سفر کی راہیں تیر رہی تھیں، ٹیڑھی میڑھی راہیں۔ اس کے ہاتھ تھک کر خود بخود چھاتی پر آگرے جیسے دو پھول ایک جھٹکے سے ٹوٹ کر نیچے گر جائیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بہہ نکلا، خزاں رسیدہ گالوں پر رینگتا ہوا ایک انگارہ میں نے اُسے بغور دیکھا۔ آنسو! یہی ہے سب کچھ جو مجھے سلمٰی سے ملا۔ جب اس نے مجھے مترنم قہقہوں کی چمک، دہکتے عارضوں کی تپش، ریشمی گیسوؤں کی باس اور مستقبل کے سپنے دیئے تو میں نے

اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے لیکن اُس آنسو کو میرے ذہن نے یوں قبول کیا. جیسے مدت سے پیاسی صدف بارش کے ایک قطرے کو چوس جائے. اب بھی وہ سلگتا ہوا آنسو میرے احساس میں محفوظ ہے اور ایک دوسرے آنسو کی تلاش میں ہے جس میں وہ خود کو سمو دے اغنا کر دے، تحلیل کر دے اور جاوداں ہو جائے۔

میں نے سُنا ہے کہ شیخ اسمٰعیل بھی بستر مرگ پر پڑی بیمار سلمٰے کو لے کر پاکستان چلے گئے ہیں۔ انھوں نے اس شہر کو چھوڑ دیا ہے جس میں ان کے بیٹے نے اپنا خون دے کر سیاسی زندگی کا ایک نیا باب شروع کیا تھا، جہاں اس کا سفید سنگ مرمر کا مقبرہ آنے والے کئی سالوں تک چاندنی راتوں میں چمکتا رہے گا اور تواریخ لکھنے والوں کو کہتا رہے گا کہ تم بھوک کے نام پر دنیا کے تمام اختلافات کو ختم کر سکتے ہو۔ تم اناج کے چند دانوں کے عوض مذہب کی غلط تخریبی قوتوں کو شکست دینے والے جذبات خرید سکتے ہو. کاش میں وہاں ہوتا! میں شیخ صاحب کو اپنے گھر لے آتا اور قریب المرگ سلمٰے کی خدمت کرتا۔ اپنی محبت کا قرض چکاتا۔ مجھے اماں نے بتایا ہے کہ ایک بار جب وہ سلمٰے کو دیکھنے گئی تھی تو باتوں ہی باتوں میں اس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مرنے کے بعد تُسے بھی اختر کے قریب ہی دفنایا جائے اور اب کیا بنے گا اس کی اس خواہش کا؟ حسرت کا، ارمان کا؟ زندگی میں اس کی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی. کوئی امید بر نہ آئی موت کے بعد بھی اس کے جذبات کا احترام نہ کیا جا سکے گا۔ وہ مر کر بھی اپنے بھائی کے قریب قبر میں نہ لیٹ سکے گی۔

اور تم لکھتے ہو کہ میں ریاست میں واپس آجاؤں کیونکہ وہاں ریفرنیڈم ہونے والا ہے۔ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے اور ریاست میں میرے استقبال کے لئے شعلے ہیں، خون ہے، بیواؤں کی آہ وزاری ہے، دوشیزاؤں کی لٹی عصمت کی جلن ہے. مجھ سا حساس انسان ان کا مقابلہ کر سکے گا؟ اس استقبال کو برداشت کر سکے گا؟ ریاست کے سونا اگلنے والے ذرے اب میرے لئے انگارے ہیں جن پر چل کر میرے پاؤں جھلس جائیں گے۔ وہاں میرے خاندان کے آدھے سے زیادہ افراد قتل کئے گئے ہیں۔ عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر جان دی ہے ان پیچ کھاتی راہوں پر ابھی میرے اقربا کا خون بہہ رہا ہے۔ وہ میرے پاؤں کے تلوؤں میں پھپھولے ڈال دے گا اور میں پھپھولوں کی جلن برداشت نہیں کر سکتا۔ لٹے ہوئے لوگوں کے گروہ جو تمھارے شہر کی گلیوں میں سر نہوڑائے بھوک سے بلکتے پھرتے ہیں سب سے پہلے وہ تمھاری توجہ کی محتاج ہیں، میں نہیں ان کی خونی داستانیں سنو، ان سے ہمدردی کے الفاظ کہو ان کے زخموں پر مرہم لگاؤ۔ بیواؤں کے سہاگ لٹ جانے کا قلق ہلکا کرو۔ وہ دوشیزائیں جنہیں عصمت لٹانے پر مجبور کیا گیا اور جو اب ڈوب مرنے کی سوچ رہی ہیں، ان کی سسکیاں سنو، ان کے آنسو پونچھو اور انھیں یقین دلاؤ کہ ہمیں اب بھی ان کی پوترتا کا یقین ہے، وہ اب بھی دیویاں ہیں۔

میری ماموں زاد بہن چند روز ہوئے راجوری کے علاقے سے یہاں پہنچی ہے۔ اپنے خاندان کے سب آدمیوں کو اپنے سامنے تڑپتے دیکھا ہے اس نے اُس کی روئیداد سنو تو تمھارا کلیجہ پگھل کر موم ہو جائے، تمھارے آنسو تمھاری آنکھوں کو جلا دیں ان تکلیفوں کا ذکر سنو جو اس نے برداشت کی ہیں، آہ!

آہوں کو محسوس کرو جو ظالم قبائیلیوں کی قید میں اس کے ہونٹوں سے نکلی ہیں، اس وحشیانہ سلوک کا اندازہ کرو جو اس کے ساتھ کیا گیا۔ وہ جب باتیں کرتی ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کل کائنات گنگ ہو رہی ہے وہ جب روتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ آسمان کی بلندیوں سے ستارے ٹوٹ کر پاش پاش ہو رہے ہیں۔ وہ رات کو سوتے میں جب چونک پڑتی ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مادر گیتی کے سینے میں کسی نے ایک تیز بھالا کھبو دیا ہو۔ وہ بتاتی ہے کہ کیمپ میں رات کو قبائلی آتے تھے اور ماؤں کے پہلو میں خوف سے سمٹی جوان بچیوں کو بے دردی سے گھسیٹ کر لے جاتے تھے جوان لڑکوں کو ہر صبح باری باری انجانی جگہ پر لے جاتے اور جو جاتے۔ ان میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہ آتا اور جب وہ اس کیمپ سے بھاگی تھی تو وہاں صرف بوڑھی اور اپاہج عورتیں اور بوڑھے اور نڈھال مرد رہ گئے تھے، زندگی وہاں سے رخصت ہو چکی تھی صرف موت کے ڈھانچ حرکت کر رہے تھے۔ وہ کس طرح مجھ تک پہونچی، اُسے راستے میں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تمہیں کبھی ملوں گا تو بتاؤں گا۔ اس وقت وہ میرے پاس بیٹھی ہے اور اس کی خودداری یہ برداشت نہیں کرتی کہ میں تمہیں اس کے متعلق زیادہ کچھ لکھوں۔ میں نے اُسے بتایا ہے کہ تم مجھے کشمیر واپس آنے کو کہہ رہے ہو اور سنو اس نے کیا کہا ہے، وہ کہتی ہے "جاؤ بھیا ایک بار ہو آؤ کشمیر۔ اور کچھ نہیں تو جو زندہ جلا دئے گئے ہیں اُن کی ہڈیاں ہی چن لاؤ۔ جو ابھی مرے نہیں، اُن کے زخموں سے بہتا ہوا خون ہی دیکھ آؤ، اور جو قریب المرگ ہیں ان کی اذیت کا اندازہ ہی کر آؤ۔"

میں ایک بار کشمیر ضرور آؤں گا۔ میں ایک بار اپنی جنم بھومی کی

خاک اپنے ماتھے پر لگانے ضرور وہاں پہنچوں گا۔ لیکن اس وقت جب سامنے ہینگر میں ٹنگا ہوا سوٹ ڈرتے ڈرتے — نہیں بلکہ خوشی سے اپنے ایک مزدور دوست کی نشانی سمجھ کر پہن سکوں گا۔ جب انسانیت نے اُتارا ہوا خون آلود پیرہن جو اب تار تار ہو چکا ہے دھو کر دوبارہ پہن لیا ہوگا۔ جب اختر کے مقبرے پر ہندو پھول چڑھائیں گے اور مسلمان دیئے جلائیں گے۔ جب دق سے گلتی ہوئی سلمیٰ کو اپنے بھائی کے پہلو میں آرام کرنے کی اجازت ہوگی اور جب میری بہن کے آنسو تھم جائیں گے، جب وہ رات کے سناٹے میں چیخ کر مادر گیتی کے مجروح سینے میں خنجر گھونپنا چھوڑ دے گی، اور جب اس کے سینے پر لگی گولیوں کے زخم مندمل ہو جائیں گے۔

اور میں افق کی پہنائیوں میں اس دن کی صبح کو کسمساتے ہوئے دیکھ رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ دن بہت جلد آئے گا۔

جنم سے جنت تک

جنم

جانے کون سے عناصر کی ترتیب سے کشمیر کی سوکھی کوکھ ہری ہری ہوگئی۔ جمود اور تیرگی کے گہرے غلاف کے نیچے جانے کیسے زندگی کا اجالا اور اضطراب کسمسانے لگا۔ ان منتیلی وادیوں میں جہاں صدیوں سے نیند اور نشہ کا غلبہ تھا۔ ایک دم بیداری کا گجر جانے کیسے بج اٹھا اس کی گونجیں ہمالہ کی چوٹیوں سے ٹکرائیں اور مظلومیت کے سینے کو چھیدتی گئیں۔

میری عمر آٹھ نو کی، سانتری کی بارہ چودہ کی اور نانک کی سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ دریائے جہلم کی اس طرف جہاں محلات تھے اور اب تنتر ہیں ایک نیا بازار ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ کے نام سے بن رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک ہی وضع کے مکان بنانے کی سکیم تھی۔ ابھی بہت تھوڑے مکان بنے تھے اور ہم بازار کے آخری کونے پر اپنے ہی ایک رشتہ دار کے مکان میں رہ رہے تھے اس وقت کشمیر انگریزوں کا تھا کشپ رشی کا نہیں، کشمیریوں کا نہیں، سورج بنسی خاندان کا نہیں، کسی سرکاری ملازم کے سرکار کا وفادار ہونے کا ثبوت انگریز کو خوش اور مطمئن رکھنا تھا۔ کبھی ہاؤس بوٹوں کو جہلم

اور ڈل میں آدھی رات تک کھینے سے، کبھی گلمرگ۔ پہلگام۔ نسیم باغ ان کے لئے وقف کرنے سے، کبھی پہاڑوں کے دامن میں امرت بھرے پھلوں کے رس کو شراب کی بوندوں میں بدل کر، کبھی جی حجور اور جی جناب کہہ کر اور کبھی چیتھڑوں میں ملبوس شفق کی سرخی، کلیوں کی باس، چاند کے نور اور کنول کی چمک سے ان کے نرم نرم بستر کو سجا کر۔ مانجھی کا بوٹ کھے کھے کر چور ہو جانا، شراب کی مستی میں گالیاں کھانا، جی حجور کے بدلے ٹھوکریں ملنا اور رات کے ساکن لمحوں میں بے دردی سے عصمت لٹانا بھی کبھی قابلِ فخر باتیں تھیں۔

"رمضان ڈار کو دیکھا اس نے اپنی بڑی لڑکی گل کو صاحب کے پیش کیا اور اب وہ بیرا نہیں صاحب کا سکریٹری ہے، وہ کسی کو بھی صاحب کے پاس جانے سے روک سکتا ہے ـــــ "

اور رمضان ڈار غریب تھا، جاہل تھا، ان پڑھ تھا اور گل کو سوکھی گھاس کا بستر نصیب ہوتا تھا اور اس کے فرن میں بیسوں پیوند لگے تھے۔ اور رنڈوے صاحب کی تنہا راتیں مانگی ہوئی شمعوں سے روشن رہتی تھیں جنہیں وہ تمام رات جل بجھنے کی حد تک سلگاتا تھا۔

ایک عام کشمیری مسلمان کی زندگی گلیوں میں سبزی بیچنے، امیرا کدل سے مہاراج گنج، زینہ کدل اور اسی طرح آخری پل تک کشتی کھیلنے اور زالنگلو کی لکڑی فروخت کرنے میں ہی گذر جاتی تھی۔ ایک عام کشمیری مسلمان مچھلی، مینڈک اور اسی طرح کے دوسرے جانوروں کی طرح تھا جو ایک ڈونگے میں پیدا ہو کر دریا کے پانی سے کھیل کر، چند ایک کشمیری گیت سیکھ کر کسی اور ڈونگے میں منتقل ہو جاتا تھا اور پھر وہاں سے قبر کی گہرائی میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ اکثریت

ایسے ہی لوگوں کی تھی جنہیں سرما کی انجماد انگیز ہواؤں میں بھی جہلم کا یخ بستا ہوا کنارہ ہی میسر آتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اس کی بہنوں اور لڑکیوں کو انگیٹھی میں جلتی ہوئی ان لکڑیوں کی آگ تاپنے کا موقع مل جاتا تھا جو انھوں نے ہی بیچی تھیں اور جن کا ایک انبار ابھی تک ان کے ڈونگے میں تھا اور جس میں سے وہ دانت کھرچنے کے لئے بھی ایک پھانس تک استعمال نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن نانک سکول سے دوڑا دوڑا گھر آیا۔ اپنے گنجے سروں پر میل سے اٹی ٹوپیاں اور پاؤں میں آدھ انچ موٹی کھال کے جوتے پہنے بہت سے مفلس کشمیری بازاروں میں گھوم رہے تھے۔ اُن کے پیچھے عورتیں رنگ دار پھٹے فرن پہنے اور ان کے اندر کانگڑیاں رکھے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی لاش کو دفنانے قبرستان تک جا رہے تھے۔ اور وہ واقعی ایک لاش تھی، کشمیر کے تاریک ماضی کی لاش اس کی جہالت، غربت اور جمود کی لاش۔ بظاہر وہ ایک جلوس تھا لیکن اس میں کوئی ترتیب کوئی تناسب اور کوئی نظم نہ تھا۔ دسمبر کی شدت کی سردی میں کشمیری جاگا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور برفباری ہونے والی تھی۔ اس کے جسم پر چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کی کانگڑی میں پڑی ہوئی چنار کے پتوں کی گرم گرم راکھ اب اپنی حرارت کھو رہی تھی۔ جلوس تنگ اور گندی گلیوں میں سے گذرتا رہا اور اس میں معاون نالوں کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہ داخل ہوتے رہے اور جب وہ پل پار کر کے امیراکدل کے اس پار پہنچا تو خاصا بڑا بن چکا تھا۔ بہت سے پنجابی یہ تماشہ دیکھنے کے لئے بھاگے اُن کے لئے ہی کیا وہاں کے رہنے والوں کے لئے بھی یہ ایک نئی چیز تھی جلوس امیراکدل کے چوک میں ٹھہر گیا، نانک بھی جلوس دیکھنے کے لئے گھر

سے بھاگ آیا تھا۔ ہم بھی اپنے برآمدے میں کھڑے تھے لیکن ہمیں وہاں سے نظر کچھ نہ آتا تھا۔ صرف کبھی کبھی بے ہنگم اور مخلوط آوازیں سنائی دیتی تھیں: "اسلام زندہ باد"۔ "شیرِ کشمیر زندہ باد" —— اور پھر شاید وہاں پر پولیس پہنچ گئی تھی۔ ایک ساتھ زمین پر لاٹھیاں ٹیکنے کی آواز گونجی اور پھر ہم نے دیکھا مرد اور عورتیں ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ کی طرف اور پاس کی گلیوں میں بھاگنے لگی تھیں۔ بیسیوں کانگڑیاں بازار میں اوندھی پڑی تھیں۔ میل سے اٹی ہوئی کئی ٹوپیاں اور کئی جوتے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد سارا بازار نیزے تانے ہوئے گھوڑ سواروں سے بھر گیا۔ شہر میں فوج آ گئی تھی اور ہر گلی میں پولیس کے سپاہی تعینات کر دیئے گئے تھے —— اور تیرگی اور جمود کا گھنا گہرا ابر ماحول پر چھا گیا۔ طاقت نے مظلومیت کو چیخنے نہ دیا۔

سڑک پر گری ہوئی کانگڑی کی گرم راکھ کا کوئی ذرہ جانے کیسے ریاست کی آخری حدوں پر جا پہنچا۔ امیراکدل کے چوک میں مری ہوئی سی آوازیں لگائے ہوئے نعروں کی گونج ان دُور دراز گھاٹیوں میں جانے کیسے جا لرزی۔ تخریب کی آندھی اُٹھی اور اپنے جلو میں شعلے اور خون لئے ریاست کے ایک حصے پر چھا گئی۔ مہاجنوں سے قرض لے کر اپنی زندگی گذارنے والے غریب کاشتکاروں اور بکریوں کے ریوڑوں کو چرانے کے لئے پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں بھٹکنے والے بکروالوں نے جانے کب اور کیسے آپس میں سازش کر لی اور مٹی کے گھروں، پہاڑوں کی چوٹیوں نالوں کے کناروں، اور تلہٹیوں میں آرام اور سکون سے بسنے والے لوگوں پر شب خون مار دیا۔ ہندوؤں کے گھر جلائے گئے، انھیں لوٹا گیا، اُن کے

بچوں کو قتل کیا گیا، اُن کی لاشوں کو درختوں سے لٹکایا گیا اور "بغاوت زندہ باد" کے نعروں سے گھاٹیاں گونجنے لگیں۔ ڈھیروں آدمی مارے گئے گھڑوں خون بہایا گیا اور چند ہی روز میں زندگی اور انسانیت کا جنازہ اٹھا دیا۔ بے گھر لوگ ڈھولوں اور نعروں کی آواز سے ڈر کر جنگلوں اور غاروں میں چھپتے پھرے اور بہت تھوڑے خوش قسمت لوگ اس جہنم کدے سے باہر نکل سکے۔

حالات پر قابو پانے کے لئے فوج آئی، گوروں کی فوج۔ ریاست کے پاس اتنی فوج نہیں تھی جو باغیوں کا مقابلہ کر سکتی۔ اب خون کشمیریوں کا تھا اور گولیاں انگریزوں کی، دل کھول کر بہایا گیا۔ سینے ہمارے تھے اور بھالے بدلشیوں کے انھوں نے خوب چھید دیے۔ کیسے تکلیف تھی، کیسے دُکھ تھا، اپنا کوئی تھا نہیں۔ ایک عرصہ تک فوج وہاں پڑی رہی۔ کھیت ویران ہو گئے، اُن میں ہل چلانے والے نہیں تھے۔ ندیاں نالے خالی تھے۔ اب وہاں پانی بھرنے قصبوں کی الھڑ لڑکیاں نہ آتی تھیں۔ اب چوپال سنسان تھے کیونکہ وہاں گوروں کی ہیبت بستی تھی۔

میں اور نانک اس بغاوت کے دو سال بعد اس علاقے میں گئے میرے چچا جھنگر میں رہتے تھے۔ اس سے پہلے بھی ایک بار میں وہاں جا چکی تھی جب میں نے سنا تھا کہ وہاں کے گوردوارہ میں کوئی شخص چارپائی پر سو سکتا تھا۔ اگر کوئی سونے کی جرأت کرتا تھا تو رات کو اس کے بستر پر کیڑے ہی کیڑے آ جاتے تھے اور اُسے کاٹتے تھے۔ گوردوارہ کے سامنے جو ٹیلہ ہے وہاں کسی بزرگ کا مقبرہ تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ جاتا تھا۔ سنا تھا کہ اس ٹیلے پر چڑھنے کی کوشش کرنے والے پر اوپر سے بھاری بھاری پتھر پھینکے جاتے تھے۔

لیکن جب میں وہاں گئی تو میں نے دیکھا کہ گوردوارہ کی عمارت بالکل جل چکی تھی اور اب تک کسی نے اُسے دوبارہ بنانے کی جرأت نہ کی تھی۔ اُس گوردوارے میں عورتوں کی بے حرمتی کی گئی تھی لیکن کسی کی چارپائی پر کیڑا نہ چڑھا تھا۔ کسی کے جسم میں ڈنک نہ لگا تھا۔ سامنے کے ٹیلے پر مقتل گاہ بنائی گئی تھی جہاں دن رات معصوموں کو قتل کیا جاتا تھا، لیکن کسی کے سر پر پتھر نہ پڑا تھا، کسی کے ہاتھ سے تلوار نہ گری تھی۔ اور ہمارے چچا نے ہمیں وہ جگہ دکھائی جہاں اس کے بچوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔ اور اس کی بیوی کی عصمت دری کی گئی تھی اور وہ درخت سے بندھا جب آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتا تھا اُس کے چہرے پر خنجر سے ٹھوکا دیا جاتا تھا۔ وہ وہاں کا ایک ساہوکار تھا اور اس کے بچوں کو مارنے والے وہ لوگ تھے جو اب تک اس کے اناج پر پلتے آئے تھے۔ امیرا کدل کے چوک میں سورج بنسی خاندان کا زعفرانی اور سرخ دھاریوں والا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ چوک میں سنگینیں تانے فوج کھڑی تھی۔ جو کوئی وہاں سے گذرتا وہ جھنڈے کے آگے سر جھکاتا، اور "مہاراجہ بہادر کی جے" کہہ کر آگے جا سکتا۔

رسول بٹ بٹمالو سے امیرا کدل پُل کے پار جا رہا تھا۔ جب چوک میں پہنچا تو بجائے جھکنے کے اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور جھنڈے کو بغور دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ تشدد اور طاقت کا جھنڈا دنیا میں کب تک لہراتا رہے گا۔ ڈیوٹی پر کھڑا سپاہی اُسے دیکھ رہا تھا رسول بٹ جھنڈے کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا لیکن اس نے سر نہ جھکایا تھا۔

"جھک کے چل، حرام زادے" ...

رسول بٹ نے مڑکر اُس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھتا گیا وہ جھکا نہیں۔

"مہاراجہ بہادر کی —" سپاہی اونچی آواز میں بولا۔

لیکن رسول بٹ خاموش تھا اور آگے قدم بڑھا رہا تھا اور آگے ایک اور سپاہی کھڑا تھا۔

"بولتا نہیں سور کے بچے" دوسرا سپاہی کڑکا۔

رسول بٹ اور آگے بڑھا اور اس کی پیٹھ میں بندوق کا کندا اور سینے میں سنگین کی نوک تھی اس کا فرن خون سے بھیگ رہا تھا اور وہ چوک میں پڑا سسک رہا تھا اور سورج بنسی خاندان کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اس میں کھبی ہوئی سُرخ دھاری زیادہ شوخ ہو رہی تھی۔

نمائش گاہ بنے ابھی ایک دو سال ہی ہوئے تھے۔ وہاں کھلے میدان میں ٹکٹکی لگائی گئی تھی اور اس بغاوت میں حصہ لینے والوں کو ہر روز اُس پر چڑھایا جاتا تھا۔ مجرم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے ٹکٹکی پر چڑھا دیا جاتا، اس کی شلوار اُتار دی جاتی۔ اس کے چوتڑوں پر پانی میں بھگو کر کپڑا ڈال دیا جاتا اور پھر تیل میں بھگوئے ہوئے بید اس کے جسم پر لگائے جاتے اور ہائی کی چیخیں اور بید کی گونجیں دور تک سنائی دیتیں۔

میں اور نانک باہر سڑک پر کھڑے تھے۔ رسول بٹ کے لڑکے رحمان بٹ کو ٹکٹکی پر چڑھایا گیا تھا کیونکہ اس کے باپ نے حکم کی پرواہ نہ کی تھی۔ وہ نانک ہی کا ہم عمر تھا۔ اُس کے جسم پر بید لگائے جا رہے تھے اور وہ چیخ رہا تھا۔ اور ہمارے قریب کھڑے کچھ لوگ کہہ رہے تھے "یہ تم سکتے تھے [illegible] راج کو، اب کرو نا بیٹا" — رحمان بٹ بیہوش

ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ عرصہ کے لئے بید لگوانے بند کر دیئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد پھر اُسے بید لگنے شروع ہوئے۔ اور جب اسے ٹکٹکی سے اُتارا گیا تو وہ مر چکا تھا۔ اب اس کے محلے والے اُسے چارپائی پر لٹا کر گھر لئے جا رہے تھے۔ اس کی سفید شلوار اس کے سرہانے پڑی تھی" اس کا نچلا دھڑ تقریباً ننگا تھا اور اس کے جسم پر نیلے نیلے گہرے نشان چمک رہے تھے اور اس کی ماں دھاڑیں مار رہی تھی۔

یہ نیلے نیلے گہرے نشان رحمان بٹ کے جسم پر نہیں کشمیر کی دھرتی کے سینے پر تھے۔ یہ بید اُسے نہیں لگے تھے کشمیر کو لگے تھے، رحمان نہیں چیخا کشمیر چیخا تھا۔ رحمان بٹ کی موت کشمیر کے ماضی کی موت تھی۔

اب مستقبل کا جنم تھا۔

آزادی کا، بیداری کا، بغاوت کا جنم۔

جنگ

سکول کی چار دیواری میں قید ایک انسان کشمیر کی سیاست میں اُبھرا۔ اس نے جماعتوں میں بیٹھے نڈھال اور غریب بچوں کو دیکھا۔ اور محسوس کیا کہ آنے والی نسل کے یہ امین اپنے فرائض ٹھیک طور سے نبھا سکیں گے۔ اُسے خیال آیا کہ وہ اُن کے ارتقا کے لئے مناسب ماحول تیار کرے جس میں وہ کر اُن کی شخصیت پنپ سکے اور ان کے حصہ میں آئی۔ دکھ، مفلسی اور احساس کمتری کی میراث ان سے چھن جائے ان کے ماتھوں پر جہالت کے ہاتھوں لگے سیاہ ٹیکے مٹ جائیں؟ وہ اپنے دماغ میں بغاوت کا کھولتا ہوا لاوا لئے سکول کی چار دیواری سے باہر نکل آیا

اپنے اردگرد اس نے نگاہ دوڑائی۔ گھپ اندھیرا تھا۔ اُسے کوئی ساتھی نظر نہ آیا اُس نے خود کو اندھیرے کی شدت گھٹ جانے کا احساس کرانے کے لئے اونچی آواز میں پکارا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ دھیمی آوازیں اسے سنائی دیں۔ کچھ عرصہ کے بعد تاریکی کے اس ماحول میں ایک شمع جگمگائی، ایک چراغ بھڑکا اور کچھ آوازیں ایک اونچی سی آواز میں بدل کر کشمیر کی وادیوں میں گونج اٹھیں اور گرم لاوے کی ایک لکیر جہلم کے ساتھ بہنے لگی۔ یہ انسان شیخ محمد عبداللہ تھا۔ جو چند ہی روز میں ایک عام سکول ماسٹر سے "شیر کشمیر" بن گیا تھا۔

کشمیر اب بھی انگریزوں کا ہی تھا کشمیریوں کا نہیں لیکن اب کشمیریوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کشمیر کو اپنا بنانے کے لئے انھیں منظم ہونا ہوگا۔ اور تمام بیرونی عناصر کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر کوہالہ کے پل اور سوچیت گڑھ کے اسٹیشن سے باہر پھینکنا ہوگا۔ انگریز نے بھی ان کے اس جذبہ کو محسوس کیا۔ اس نے ایک بار گلمرگ کی شاداب اور معطر وادی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں مغل شہنشاہوں کے باغات کی طرف اٹھیں۔ اس کی نظریں ڈل کی سطح پر تھرکتے ہوئے بجروں پر بھی پڑیں اور اس کے ہونٹوں پہ ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس میں ایک بھرپور سیاسی وار پنہاں تھا۔ وہ وار سادہ لوح لیکن بھڑکے ہوئے کشمیریوں کے دماغ پر پڑا اور اپنا کام کر گیا۔ ریاست بھر میں ریاستی اور غیر ریاستی باشندہ کی تحریک پھیل گئی۔

انگریز کے خلاف امڈا ہوا طوفان پنجابیوں سے آ ٹکرایا۔ وہ پنجابی جنھوں نے کشمیر میں آکر اُسے غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر

جگایا تھا، جنہوں نے ریاست کے غیر آباد علاقوں میں چراغ جلائے تھے، جنہوں نے کشمیر کی جہالت اور غربت سے فائدہ اٹھا کر بے پناہ دولت سمیٹی تھی اور بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کی تھیں۔ کشمیریوں نے کہا پنجابیوں کو ریاست سے باہر نکال دو۔ اُن کا چناب اور جہلم کے پانی پر کوئی حق نہیں۔ پہاڑ کے دامن میں اُگے پھولوں کا رس اُن کے لئے نہیں۔ پامپور کے زعفران کے کھیتوں تک وہ نہیں پہنچ سکتے۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے ہی پانی، یہی پھل اور یہی زعفران پنجابیوں کے گھروں میں منتیں کر کے پہنچائے جاتے تھے۔

جلد جوش میں آجانے والا پنجابی ناراض تھا، اسکی تیوراتی ہوئی آنکھوں میں آنچ تھی اور انگریز کیلاش کی چوٹیوں پر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔

اور پھر مسلم کانفرنس کا نعرہ "اسلام زندہ باد" فضا میں کوندے کی طرح لپکا۔ کشمیری مسلمان اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ شیر کشمیر گرجا ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لئے انھیں زیادہ حقوق ملنے چاہئیں تھے۔ ملازمتوں میں اُن کا تناسب بڑھایا گیا، بڑے بڑے عہدے انھیں دئے گئے لیکن وہ اس سے مطمئن نہ تھے وہ حکومت میں ایک بنیادی ردوبدل چاہتے تھے۔ وہ سورج بنسی خاندان کے جھنڈے کے سامنے اسلامی جھنڈا گاڑنے کے۔ خواہشمند تھے پنجابیوں کو ریاست سے باہر نکالنے والوں نے دور دور کے لیڈروں سے مشورے کئے، سالانہ اجلاس بلائے اور انھیں رہنمائی کی دعوت دی۔ تعصب کا جذبہ ہر مسلمان کے دل میں بھرنے کی کوشش کی گئی۔

ایک طوفان اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ قومیت کے پرستاروں نے اس وقت محسوس کیا کہ کشمیر کی وادی عنقریب خون کی ندیوں میں غرق ہو جائے گی انھوں نے خیال کیا کہ ایک عام کشمیری کو ورغلا کر اس کا مستقبل تاریک کر دینے کی سازش ہو رہی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ پنجاب میں بہنے والے پانچ دریاؤں کے بیچ میں تعصب کا زہر گھولا جا رہا تھا اور یہ زہر دریاؤں سے نکلتی ہوئی ہر نہر اور اس کی ہر شاخ میں حل ہوگا اور پنجاب کے ہر حصے میں پہنچ جائے گا اور ہر روح کو کم آلود کر دے گا۔

عین اس وقت شیرِ کشمیر نے اس انتشاری ماحول کو ایک سیاستدان کی نظروں سے ٹٹولا۔ اس نے کشمیری عوام کی جہالت، غربت اور اذیت کا اندازہ کیا لیکن اونچے اونچے پہاڑوں کو پھلانگ کر وادی کے باہر سے آتی ہوئی آوازیں بھی اس کے کانوں میں گونجیں۔ اس نے اپنے دماغ پر بوجھ ڈالا۔ ایک عرصہ تک سوچا اور پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ فرد کی زندگی سماج کی زندگی سے الگ نہیں ہو سکتی، فرد سماج کا جزو لاینفک ہے، سماج کی ترقی فرد کی ترقی ہے اور سماج کا تنزل فرد کا تنزل۔ اس نے پہلی بار کشمیر کے رہنے والوں کو ایک کشمیری کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی، ہندو اور مسلمان کے روپ میں نہیں۔ مشاہدہ کا یہ طریقہ نیا تھا لیکن اسے پسند آیا اس نے محسوس کیا کہ کشمیر کے کھیتوں کا اناج کھانے والا، اس کے چشموں کا پانی پینے والا ایک کشمیری پہلے ہے اور ہندو اور مسلمان بعد میں اور ہندوستان میں بسنے والا — کشمیر کا ایک باشندہ ایک ہندوستانی پہلے ہے اور کشمیری بعد میں۔ اس نے اپنے اس نظریئے کو اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھا۔

کچھ نے قبول کیا اور کچھ نے ناپسند، ناپسند کرنے والے اسے قائل نہ کر سکے اگرچہ ان کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کا باغی دماغ ایک بار پھر جنگ کے لئے تیار ہو گیا، تعصب اور فرقہ وارانہ تلخی کے خلاف جنگ اور میں نے، ساوتری نے، نانک نے، ہم سب نے ایک نئے ادارے کے جنم کی خبر سنی۔ نیشنل کانفرنس —— ہندوؤں نے ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کیں مسلم عوام چلائے، یہ ایک دھوکا تھا۔ ان کے لیڈروں نے اُن سے غداری کی تھی۔ لوگوں کی رائے شیر کشمیر کے خلاف ہو گئی اور اُن لوگوں کو جنہوں نے ہمیشہ اس کے راستے میں روڑے اٹکائے تھے اپنی تخریبی قوتوں کو استعمال کرنے کا وقت مل گیا۔ اس طرح ایک نیا محاذ قائم ہو گیا اور کشمیری مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کچھ عرصہ شیر کشمیر کی نیت پر غلط شبہ کرنے کے بعد عوام نے دوبارہ اس کی لیڈرشپ کو قبول کر لیا —— اور کشمیر کی تاریخ میں پہلی بار قومیت کے احساس نے جھرجھری لی اور اپنے سامنے فرقہ وارانہ تعصب کے خون آلود بھیڑیئے کو کھڑا پایا۔

کشمیر کی قومی تحریک آگے بڑھتی گئی۔ نانک نے اپنے ایک دوست محمد شفیع کے ساتھ مل کر اس میں کام کرنا شروع کیا۔ ہر قصبے میں نیشنل کانفرنس کی شاخیں قائم کیں اور اخوت اور مساوات کا پرچار کیا۔ پتا جی نے اسے ایک اچھی ملازمت دلائی لیکن وہ اس جھنجھٹ میں نہ پڑا۔ اسے گلے میں کھدر کی ہلکی سی چادر ڈال کر گاؤں گاؤں کی خاک چھاننا ہی پسند تھا۔ محمد شفیع نے میرپور اور جموں کے علاقے میں اور نانک نے کشمیر کے ایک حصے میں نیشنل کانفرنس کے اصولوں کا

پرچار کیا۔ مسلم کانفرنس کے اوچھے کارکنوں نے انھیں کمینہ ڈھنگوں سے ستایا اور ایک دو بار قتل کرنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن اب کشمیر کا ہر مسلمان، ہر ہندو اور ہر سکھ نانک، محمد شفیع اور بدھ سنگھ بن چکا تھا۔ عوام پر فرقہ دارانہ تعصب کی گرفت بہت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اب اُسے صرف ایک مضبوط جھٹکے کی ضرورت تھی۔ مزدور یونین نے بھی قومی کارکنوں کا ہی ہاتھ بٹایا —— اور رفتہ رفتہ کشمیر کی سیاست میں ابراہیم لنکن سا لمبا اور سادہ انسان ابھرا اور ایک بین القوامی شہرت کا مالک بننے لگا۔

اور پھر جانے کیسے "کشمیر چھوڑو" کی تحریک شروع ہوگئی۔ تقاریر میں آگ اور شعلوں سے کام لیا گیا عوام کو زرخرید غلام بنے رہنے کی ذلت کا احساس کرایا گیا اور حکومت کی نئے سرے سے تشکیل کرنے کی مانگ کی گئی۔ عہد نامہ امرتسر کی یاد دلائی گئی اور حکمران سے کہا گیا کہ اسے کشمیر پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ حکومت کی مشینری حرکت میں آئی۔ تشدد اور طاقت کا استعمال ہوا اور کشمیر کی سیاسی ترقی کا ذمہ دار لیڈر شیخ محمد عبداللہ قلعہ باہو میں محصور کر دیا گیا۔ لوگوں میں ناراضگی اور اطمینان دونوں کی جھلک نظر آئی لیکن زیادہ غلبہ ناراضگی ہی کا تھا۔ سٹیٹ پیپلز کانفرنس کے ڈپٹی پریذیڈنٹ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا اس کی حمایت میں کانگرس کے کئی لیڈر کشمیر آئے لیکن اپنے مقصد میں ناکامیاب رہے اپنے ساتھی کارکن سے ہمدردی جتاتے اور حالات کو ٹھیک طور سے سمجھنے کے لئے پنڈت نہرو بھی آئے لیکن انھیں کوہالہ کے پل پر ہی سنگینوں اور بندوقوں سے روک دیا گیا۔ بھارت ماتا کے اس سپوت کے خلاف اٹھی ہوئی سنگینیں ملک کے ہر انسان کے سینے میں چبھیں، ہر ہندوستانی

چیخا، یہ چیخیں بجلیاں بن کر کشمیر کی وادی میں کڑکیں اور کاک وزارت سٹ پٹائی۔

اور میں نے جب نانک اور شفیع سے "کشمیر چھوڑو" تحریک کی وضاحت چاہی تو وہ میری تسلی نہ کرا سکے۔

اور گلمرگ میں ٹھہرے "ایک صاحب" نے جب رمضان ڈار کو بیگار کا کام کرنے کے لئے کہا تو اس نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور زمین پر تھوک دیا۔

رمضان ڈار اگرچہ جاہل، ان پڑھ اور غریب تھا لیکن اس کے دماغ میں بغاوت کا شعلہ بھڑک چکا تھا۔

موت

اور پھر پنجاب تقسیم ہوگیا۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین کے ٹکڑے کر دئے گئے۔ اس کے گیتوں کو توڑ دیا، اس کی گھٹتی ہوئی ساکن زندگی میں تخریب کا اضطراب بھر دیا۔ راوی کا وہ کنارہ جہاں ایک صبح وطن کے سپاہیوں نے آج سے تقریباً سولہ سترہ سال پہلے بدیشی حکومت سے آزاد ہونے کا حلف اٹھایا تھا، جلیانوالہ باغ جہاں ہندو اور مسلمان دونوں نے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مشین گنوں کی گولیاں کھائی تھیں، آج دو مختلف ممالک کی سرزمینیں ہیں، ان پر قومیت اور اتحاد کا لہراتا ہوا پرچم سرنگوں ہو گیا ہے۔ نئی قدروں کے علمبرداروں نے دنیا کے سامنے اپنی ایک نئی تخلیق پیش کی تھی۔ پنجاب کا چھٹا دریا، خون کی ایک ندی، جس کا مخزن وہی دماغ تھا جس نے ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ کو غدر کا نام دے کر جیت

لیا، جس نے 'ہندوستان چھوڑو' کی تحریک کے باوجود برما اور مصر کی حدوں پر اپنا خون بہانے کے لئے ہندوستانیوں کو خرید لیا، جس نے کشمیر کی وادیوں میں بھیڑوں کی طرح گھومتے ہوئے کشمیریوں کو دیکھا اور مسکرا کر خاموش ہو گیا ——— وہ ایک بار پھر مسکرایا، اس کی طلسمی مسکراہٹ بجلی کی طرح چمکی اور دنیا کے سامنے ایک نئی تخلیق آگئی۔ سسکیوں اور آہوں کا مرقع، آنسوؤں اور ڈوبتی نبضوں کا مجموعہ، زخموں اور داغوں کی کسک۔ کتنا مہلک تھا یہ آخری وار! تہذیب مر گئی، تمدن اجڑ گیا اخوت سینہ پیٹ کر رہ گئی اور انسانیت موت کے سامنے اپنا تار تار دامن پکڑے کھڑی نظر آئی۔ خون کا دریا بہا اور پھر ایکدم متلاطم ہو گیا اپنے کناروں کو غرق کرتا، دور دور تک زندگی کے آثار مٹاتا وہ آگے بڑھتا گیا ——— جب یہ طوفان اتر جائے گا تو اپنے دونوں کناروں پر ایک اتنا عمیق اور وسیع سرخ رنگ کا دلدل چھوڑ جائے گا جس میں کئی تہذیبیں لڑکھڑائیں گی، کئی تمدن دھنسیں گے اور کئی کلچر سڑیں گے۔ انسانی زندگی کا کوئی بھی راہنما صحیح و سالم آگے نہ بڑھ سکے گا اور ایک مدت تک فضا انسانی لاشوں کی سڑاند سے متعفن رہے گی۔

میں ان دنوں بارہ مولہ میں تھی۔

راولپنڈی جہلم اور پشاور سے جان بچا کر بھاگے ہوئے ہندوؤں کے بھاری گروہ لاریوں میں، چھکڑوں میں اور پیدل کوہالہ کے پل کو پار کر کے اس ساکن اور محفوظ وادی میں داخل ہونے لگے۔ بارہ مولہ کا چھوٹا سا قصبہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سرائے میں بدل گیا۔ فرنٹیئر کے سکھ، پٹھار کے پٹھان نما ہندو، پنجاب کے بنئے اور ان سب کے

ان داتا دھرتی کے بیٹے غریب کاشتکار خانہ بدوشوں کی طرح رفتہ رفتہ ریاست کے ہر کونے میں پہنچ گئے۔ سری نگر کے بازاروں میں زندگی کے یہ اجڑے ہوئے قافلے گزرتے اور فضا میں ایک تلخی اور اداسی بھرتے چلے جاتے۔

نیڈ دادن خان کی گاڑی میں سے بچے چند مسافروں میں وہ نوجوان لڑکی بھی شامل تھی جو ایک شام مجھے نالے کے پل پر اکیلی مل گئی میں اس کے قریب گئی تو وہ سہم گئی، میں نے اس سے باتیں کیں تو وہ خاموش رہی میں نے اس سے ہمدردی جتائی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

میرے گھر کے بھی افراد مارے گئے ہیں اب میرا کوئی نہیں، آج اس نالے کا سہارا لینا چاہتی تھی ——— " اور جانے مجھے یہ کیسے محسوس ہونے لگا کہ ایک دن مجھے بھی یہ سہارا لینا پڑے گا، ایک دن مجھے بھی مدد کے لئے موت کے آگے ہاتھ پھیلانے ہوں گے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تقریباً ایک ہفتہ سے بارہ مولہ میں تھی اور تین چار روز سے شہر کا ایک معزز سرمایہ دار اُسے اپنی عصمت بیچ کر روٹی کے چند نوالے خریدنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ مجھے اسکا دکھ اپنا دکھ لگا۔ میں اُسے اپنے گھر لے آئی، میں نے اس یتیم ہم عمر کو اپنے گھرانے کا ایک فرد بنا لیا۔ اس کا نام کملا تھا ——— اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد بیرونی لٹیروں نے ریاست کی حدوں پر حملے کرنے شروع کر دئے۔

اس وقت نانک، محمد شفیع اور نیشنل کانفرنس کے دوسرے سرگرم کارکن جیل میں تھے اور ریاست میں فرقہ وارانہ تلخی زور پکڑ رہی تھی بہت سے غیر ذمہ دارانہ آدمی عوام میں تعصب کا زہر بھر رہے تھے۔ لوگوں

میں ایک عجیب قسم کا ہراس پھیل رہا تھا اور لوگوں کی نگاہیں بھدروہ کی جیل کی طرف تھیں جہاں ان کا محبوب راہنما قید تھا۔ جس نے اپنی زندگی کا مشن وطن پرستی اور قومیت بنایا تھا۔ کاک وزارت کا ذہنی بوجھ ریاستی سیاست کو اندر ہی اندر کچل رہا تھا اور ریاست کی حدوں سے تشویشناک خبریں مل رہی تھیں۔

حملہ آوروں نے کوہالہ کے پل کو پار کر لیا، دیکھتے ہی دیکھتے اوڑی پہونچ گئے۔ ہمیں سوچنے کی بھی فرصت نہ ملی اور انھوں نے مہورہ کے بجلی گھر پر قبضہ کرکے سری نگر کو ایک اندھیری اور بھیانک رات میں غرق کر دیا۔ اور اس گہری تیرگی میں بڑھتے ہوئے بارہ مولہ میں آگئے۔ کتنا خوفناک منظر تھا وہ! پٹھان تمام قصبے پر اپنی ہیبت اور بربریت کے نقوش گاڑ رہے تھے۔ خبر ملی کہ کشمیر ہند یونین میں شامل ہو گیا تھا، نانک اور محمد شفیع جیل سے باہر آرہے تھے، شیخ عبداللہ کو عارضی وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تھی اور سری نگر میں ہندوستانی فوجیں پہنچ گئی تھیں۔ اس دوران میں ہم پہ کیا گذری، بارہ مولہ کے قصبے پہ کیا گذری، اس میں بسنے والے لوگوں پر کیا گذری۔ اس کی ترجمانی بارہ مولہ کے کھنڈر اس کے نالے سے اٹھتا ہوا تعفن اور اس کے کھیتوں میں پڑے ہوئے انسانی پنجر کریں گے۔ آنے والے وقتوں کا مورخ جب نئے کشمیر کی تواریخ لکھے گا۔ تو بارہ مولہ کو کشمیر کا ٹیکسلا کہے گا۔ جس میں ایک تہذیب، ایک تمدن آبادی کا ایک حصہ چند گھنٹوں میں مٹ گیا تھا۔ اگر مارتنڈ میں پانڈوں کے کھنڈر ابھی تک اُن کی تہذیب کے آئینہ دار ہیں تو بارہ مولہ آنے والی کئی صدیوں تک کشمیر کی جنگ آزادی کو زندہ رکھے گا۔

ہم سب اپنے مکان کی چھت پر کھڑے تھے اور قصبے کی تباہی کا ہولناک منظر دیکھ رہے تھے۔ لٹیروں کا گروہ ہمارے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا، ہوا میں فائر کئے جا رہے تھے اور سامنے چوک میں مقبول احمد کی لاش سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ اُسے کھمبے سے باندھ کر چودہ گولیاں ماری گئی تھیں۔ اس نے بارہ مولہ کو بچانے کے لئے اپنی جان گنوائی تھی، وہ نانک کا دوست تھا۔ اور نانک کرپان ہاتھ میں لئے ہمارے ساتھ چھت پر کھڑا تھا لٹیرے ہمارے گھر کے نیچے پہونچ گئے تھے۔ اماں میرے پتاجی کو قتل نہ کر سکی تھی، وہ رو رہی تھی اور نانک نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور وار کیا تھا اور خود دیوار پھلانگ کر چھت سے نیچے اُتر گیا تھا۔ ایک ہندوستانی لڑکے نے اپنے باپ کو مار ڈالا تھا۔ پتاجی کا دھڑ تڑپ رہا تھا۔ اور کلا اماں سے اسے معاف کر دینے کو کہہ کر کرپان کو لرزتے ہاتھوں سے تھام رہی تھی۔ خون کا ایک فوارہ پھوٹا اور اماں کا سر ہمارے سامنے گر پڑا۔ اور پھر ساوتری نے آگے بڑھ کر وہی کرپان اٹھائی اور غصہ بھری آنکھوں سے کلا کی طرف جھپٹی اور اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ لٹیرے مکان کے دروازے توڑ رہے تھے اور ساوتری میرا ہاتھ تھامے مجھے چھلانگ لگانے کو کہہ رہی تھی اور میرا دل ڈوب رہا تھا اور میں لرز رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ چھت کے کونے تک گئی لیکن جب چھلانگ لگانے کا وقت آیا تو میری ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مجھے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ ساوتری بازار میں پڑی تڑپ رہی تھی۔ اس کے سر سے لہو بہہ رہا تھا۔ اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک لٹیرے نے اپنے بھاری بوٹ سے اسے کے زخمی سر کو زور

سے ٹھکرا دیا تھا - اس کا جسم زیادہ شدت سے تڑپا اور جب میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو ایک پیٹھان نے مجھے دبوچنے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے تھے۔ میری بزدلی نے مجھے ایک قیدی بنا ڈالا تھا - بازار کے عین درمیان وہ نانک کو بے رحمی سے قتل کر رہے تھے ، اس نے ان کا ایک آدمی مار ڈالا تھا - اس لئے اس کے خوبصورت جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا تھا - میں زور زور سے چیخ رہی تھی اور میرے بھائی کا خون جنم بھومی کے سینے کو تر کر رہا تھا - میں قیدی تھی اور میرا بھائی اور بہن امر ہو چکے تھے -

لٹیرے مجھے میری ہی کئی اور بہنوں کے ساتھ جلتی ہوئی وادیوں میں سے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے ہمارے پاؤں میں آبلے تھے اور جسم میں داغ لیکن بیدردوں کو پرواہ نہ تھی - راستے کے نوکیلے پتھروں سے چھل کر جب ہمارے انگوں سے خون بہتا تو وہ ہنستے ۔ کتنا پیار تھا ظالموں کو خون سے - ہمارے ساتھ کئی نوجوان مائیں بھی تھیں اور انھیں بچے ساتھ لیجانے کی اجازت نہ تھی - اگر کسی نے اپنے لختِ جگر کو سینے سے چمٹا کر شعلوں میں سے گزرنے کی کوشش کی تو اس کے بیٹے کو سب کے سامنے عذاب دے دے کر مار ڈالا - ہمیں گجرات لایا گیا ظلم اور بربریت کے علمبردار پٹھان جو کبھی ہینگ اور زیرہ بیچنے کے لئے گلیوں میں چلایا کرتے تھے - اب خود کو حاکم وقت سمجھتے تھے - وہ اکثر ہم سے کہتے -

"اب ہم نوشہرہ میں جائے گا - تمھارے لئے خوب زیور لائے گا ، ہم تم کو کابل لے جائے گا - تم ادھر ہمارا انتظار کرنا" -

اور میرے ذہن کی گہرائیوں میں ایسا ہی ایک پٹھان ابھرنے لگتا - جسے میں نے بچپن میں دیکھا تھا - ایک بڑا سا فرغل اور ایڑیوں تک اونچی شلوار پہنے - واسکٹ میں چمکدار سیپ کے بٹنوں کی کئی درجنیں لگائے گلیوں میں چلاتا پھرتا تھا -

"ہینگ زیرہ لے لو، ہینگ زیرہ ——"

اور میں خوف سے گھر کے اندر بھاگ جایا کرتی تھی - ایک دن پتا جی نے ایک پٹھان کو گلی میں زیادہ چیخنے پر پٹوایا بھی تھا - اب وہی پٹھان مجھے بیچنے کے لئے لے جا رہا تھا - اپنی بے عزتی کا بدلہ لے رہا تھا وہ -

بزدل اور ننگِ وطن جو موت سے گھبرا کر زندگی کی ذلت کی طرف بکی تھیں اب اپنے مستقبل سے غافل ہوتی جا رہی تھیں اور کبھی کبھار کسی پرانے اخبار سے پتہ لگتا تھا کہ سکیورٹی کونسل میں کشمیر پر بحث ہو رہی تھی ۔ کشمیر برباد ہو رہا تھا اور بحث بڑھتی جا رہی تھی ۔ کشمیر مر رہا تھا اور اس کا علاج کرنے والے اس سے کھلواڑ کر رہے تھے ، شعلے سلگ رہے تھے اور کنواں کھودنے کی تجویز پر غور ہو رہا تھا -

انگریز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر کچھ پھیکی پھیکی سی جیسے اسے اپنے جادو پر اب پہلا سا وشواش نہ رہا تھا -

جیت

"نوشہرہ فتح ہو گیا - پٹھان واپس آ گئے اور اپنے اپنے حصے

میں آئی عورتوں کو لے کر مختلف مقامات کی طرف چل پڑے ۔ اس پٹھان نے جس کے حصے میں میں آئی تھی مجھے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس نے کسی اور کے ہاتھ اور اس طرح میں اپنی عصمت لٹاتے لٹاتے اس آدمی کے پاس پہنچی جس نے مجھے اس تنگ سی گلی کے ایک چوبارے میں قید کر رکھا ہے۔ میں اس چوبارے میں بیٹھے بیٹھے تمام دن گذار دیتی ہوں۔ وہ باہر سے کنڈی چڑھا کر دن بھر جانے کہاں رہتا ہے۔ سورج غروب ہو جانے پر لوٹتا ہے اور پھر مجھے درندوں کی طرح نوچتا ہے اور مدافعت پر پیٹتا ہے۔ میرے سامنے والے چوبارے میں بھی مجھ جیسی ہی ایک لڑکی ہے۔ ہم دونوں تمام دن ایک دوسرے کو آنکھوں اور ہاتھوں سے اشارے کر کے وقت گذار دیتی ہیں۔ اُسے دیکھ کر مجھے اُن خوبصورت سفید سفید اون والی بھیڑوں کا خیال آ جاتا ہے جو میں نے اکثر پہاڑوں کی چوٹیوں پر گھومتے دیکھی ہیں۔ وہ کتنی خوبصورت لیکن کتنی کمزور ہے۔ اس کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ اُسے خود معلوم نہیں کہ وہ کس کا بچہ ہے۔ وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ وہ ایک حرامی بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کے پیٹ کے اندر جہنم کی آگ دہک رہی ہے اور وہ آنسوؤں کی بوندوں سے اُسے سرد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کاش اُسے کوئی بتا سکے کہ جہنم کے شعلے آنسوؤں سے نہیں بجھا کرتے۔ بلکہ وہ اور بھڑکتے ہیں۔

کشمیر میں اب فتح کے شادیانے بج رہے ہیں۔ گولیوں سے گونجنے والی گھاٹیاں اب فتح کے گیتوں سے گونج رہی ہیں۔

ریاست کا بچہ بچہ اپنے آپ کو ایک آزاد شہری محسوس کر کے خوشی سے ناچ رہا ہے، جھرنے مبارک کے گیت گا رہے ہیں۔ پھول خوشبو کی لپٹوں سے ہر وادی کو مہکا رہے ہیں ——— بارہ مولہ - اوڑی - جھنگر - راجوری اور پونچھ سے لٹیروں کو نکال دیا گیا ہے اور کشمیر کا راہنما سیکورٹی کونسل کے بھیجے ہوئے کمیشن کو گرج کر کہہ رہا ہے کہ کشمیر کے باسی اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کا عہد کر چکے ہیں۔ اب وہ اُسے اپنے خون سے زندہ رکھیں گے — انگریز اب بھی مسکرا رہا ہے اور دوستی ہاتھ بڑھا رہا ہے لیکن اس کی ہنسی میں خفت اور ذلت کا امتزاج ہے اور اس کے ہاتھ میں اٹم بم کی بربادی ہے اور میرے ہموطن بہت سادہ ہیں۔ بھگوان اُن کی رکھشا کرے!

ڈیڑھ صدی انگریز کے قبضے میں رہنے والا کشمیر اب کشپ رشی کا کشمیر ہے۔ اب وہ کشمیریوں کا ہے، اب وہ اپنے غریب بہادر محب وطن عوام کا ہے۔ اب اس کے زعفران اور پھلوں پر اس کا اپنا حق ہے۔ اب اس کے باغوں کی باس اُس کے اپنے لئے ہے۔ ایک گداگر سے بادشاہ بننے میں اسے اپنے بچوں کو، مردوں کو، عورتوں کو آگ اور خون کے طوفان میں سے گذارنا پڑا ہے۔ رحمان بٹ نے اپنے جسم پر کھائے ہوئے کوڑوں سے کشمیر کی تقدیر کو جگا دیا ہے۔

آنے والی نسلیں اُن عورتوں کا فخر سے نام لیں گی جنہوں نے اپنے وطن کی آبرو بچانے کے لئے اپنی جانیں تلی پر رکھیں

اور خود کو شعلوں میں پھینکا۔ ان کے بچے جب ان کا نام لیں گے
تو ان کے سر غرور سے اونچے ہو جائیں گے۔ وہ تواریخ کے اوراق
میں اپنا مستقبل نقش چھوڑ گئی ہیں — اور ان عورتوں کا نام بھی
آئے گا جو چھت سے کود نہ سکیں، پستول سے اپنا سینہ چھلنی نہ
کر سکیں، خود کو شعلوں میں پھینک کر راکھ نہ ہو سکیں۔ جنھوں نے
موت کی وقار بھری ہیبت سے خوف کھا کر زندگی کی پستی سے
پناہ مانگی۔ جنھوں نے سیتا اور دمینتی کے ناموں کو سیاہی سے
بھر دیا۔ کوئی بھی خوددار کشمیری اُن کے ساتھ اپنا رشتہ نہ جتائے
گا اور ان کا نام سُن کر تھوک دے گا۔ وہ کہے گا اس نام کی کوئی
عورت اُن کے خاندان میں ہی نہ تھی اگر کوئی تھی تو وہ کشمیر کے
جلنے سے بہت پہلے مر چکی تھی۔ کشمیر کے شعلوں سے اس کا کوئی
تعلق نہ تھا۔

کشمیر میں چراغاں ہو رہا ہے اور ہم اپنی لٹی ہوئی عصمت
کی آگ میں جل رہی ہیں۔ آزادی کی کرنوں میں کیلاش کی چوٹیاں
چمک رہی ہیں اور ہمارے ماتھوں پر لگے کلنک کے ٹیکے سلگ
رہے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر عورتیں ان بچوں کا بوجھ اُٹھائے
ہوئے ہیں۔ جو ہماری کوکھ سے پیدا ہو کر بھی ہمارے نہ ہوں
گے۔ تلوار کی نوک پر لٹا کر ہمیں اُن کی تخلیق پر مجبور کیا گیا ہے
ہم پر کڑے پہرے لگائے گئے ہیں۔ یہ بربریت اور ظلم کے نقوش
ہیں جنھیں اپنا خون پلا کر زندہ رکھنے پر مجبور کیا جائے گا ہمیں۔
ہماری ذلت اور بزدلی کے مجسمے جونکیں بن کر ہمارے تھنوں

سے چمٹیں گی۔ ہم درد سے بلبلائیں گی۔ لیکن انھیں اُتار پھینکنے پر
ہمارے ہاتھ کاٹ دئے جائیں گے — اور ایک دن آئے گا
جب چنگیز خاں اور ہلاکو کے یہ پیرو پھر کشمیر کی دھرتی کو
زخمی کرنے کی کوشش کریں گے۔ اپنی ماؤں کے کلیجے چھلنی
کریں گے اور انھیں حرامی بچے جننے کی سزا دیں گے۔
کاش چند دنوں تک پھوٹنے والا اُبلتا ہوا لاوا اندھے
غار میں ہی سما جاتے؟ کاش میری دکھی اور نڈھال ہمسائی
بہن بچے کو جنم دیتے ہی اس کا گلا گھونٹ دے اور اپنے ماتھے
پر لگے کلنک کے ٹیکے کو پونچھ ڈالے!

ختم شد

بادشاہوں کا مُنہ چڑا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا تھا۔ کہ میرے اس فرغل کے پھیلاؤ میں سینکڑوں شہنشاہیاں پناہ لے سکتی ہیں۔ اس کے ڈھیلے پن میں بڑے سے بڑے طوفان کا تماؤ سکون پا سکتا ہے۔ اور یہ کشمیری آبشاروں کے گیت سُننے والا، پھولوں کی باس میں بسنے والا، پھلوں کے امرت کو چکھنے والا، انسانی زندگی کے ارتقا کی مختلف منزل سے غافل، اپنے ہی نقطے پر کھڑا دُور اُفق میں اُجالے اور ظلمت کی کشمکش کو غیر جذباتی انداز سے تکتا رہا۔

ہمالہ کی چوٹیوں کو چمکانے والی کرنوں نے کنول کے پھولوں سے کھیلنے والی چاندنی نے سیماب کی طرح چھٹتے ہوئے چشموں نے کھلے آسمان میں ہنستے تاروں نے اس کے ذہن میں اپنے اپنے نقش مرتسم کئے۔ اور اسے ایک فنکار بنا دیا۔ اس نے اپنے جذبات کو فن کے سنوارنے میں لگا دیا۔ اس کی تخلیقات دُنیا کے ہر گوشے میں پہنچیں۔ ہر شہنشاہ کے دربار میں پیش ہوئیں۔ ہر ملک کی نمائش گاہ میں رکھی گئیں۔ لیکن ان کا خالق جو ان کو دیکھنے کے لئے آنکھوں والا ہے کشمیری گمنام ہی رہا۔ کسی نے اس کی قدر افزائی نہ کی۔ کبھی اسے اس کے فن کی پوری قیمت نہ دی۔ بلکہ یورپ میں لگی ایک عام سی تصویر کو بڑی سے بڑی قیمت پر خرید کر اپنے ڈرائینگ روم کی زینت بنانے والے لوگ کشمیری مزدور کے فنی خلوص اور اس کی محنت کی داد نہ دے سکے۔ اور گندھرب لوک کا یہ فنکار بھوکا ننگا اور بیمار رہ کر فن کی خدمت کرتا رہا۔ اس کا فن اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ لیکن اس کی اپنی ذات انحطاط کی گہرائی میں ڈوب گئی۔ اور اس کا استقلال کبھی متزلزل نہ ہوا۔

ایک دن رحمن نے اپنے بنائے ہوئے مرمریں تاج محل پر کھڑے ہو کر اپنے ماحول کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا۔ زمین پر بھوک، جہالت اور سامراجی دباؤ ایک طرف کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ تاریک پس منظر میں گاٹ ٹھنے والے فن کار نے زمین کی پستی کی طرف بھی دھیان دیا۔ اور اسے محسوس ہوا۔ کہ وہ بھوکا ہے۔ اور بھوک انتقاد کے پردہ اندر ہیں ایک

جائزہ

کشمیر کی حیثیت تاریخ میں اس خوبصورت عورت کی طرح رہی ہے۔ جسے ہر بادشاہ نے خرید کر اپنے حرم میں رکھنا چاہا۔ آلیں کی اس چھینا جھپٹی میں بھی اس کا حسن اور نکھار بڑھتا گیا۔ اسے اشوک کے دربار میں ایک عزت کی جگہ حاصل ہوئی۔ تاتاریوں نے اسے حاصل کرنے کیلئے اس کی حسین وادیوں میں خون بہایا۔ اور پھر مغل شہنشاہ اکبر نے اس کے زخموں پر مرہم لگایا۔ اور اس کے حسن میں اضافہ کرنے کے لئے کاجل، سُرخی اور غازہ کا استعمال کیا۔ نسیم باغ، نشاط باغ، شالامار باغ مغل شہنشاہوں کے اسی تعمیری دور کے ترجمان ہیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ یہ احمد شاہ ابدالی کی حراست میں رہ کر مہاراجہ گلاب سنگھ کی خدمت پر مامور کی گئی۔ اس نے پچھتر لاکھ روپے کی رقم دیکر اسے ہمیشہ کے لئے خرید لیا۔ اور اب تک یہ ایک وفا شعار عورت کی طرح ان کے خاندان کی خدمت کرتی آئی ہے

یہ ہے مختصر الفاظ میں کشمیر کی تاریخ۔ لیکن اس کے بیٹوں کی کہانی کچھ مختلف ہے۔ کشمیر میں رہنے والے ایک ہی رفتار سے چلتے گئے۔ طوفان آئے۔ آندھیاں اُٹھیں شعلے لپکے۔ لیکن صدیوں کی غربت اور جہالت کا بوجھ سر پر اٹھائے کشمیری ان سب سے بے نیاز دشوار گذار تنگ پگڈنڈیوں پر ایک ان جانی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔ جبر کے تیز انجکشن نے اس کے احساس کو کچل دیا تھا اس کا جسم گویا شعلوں کی تپش، زخموں کی کسک اور پتھروں کی ٹھوکروں کو محسوس ہی نہ کرتا تھا۔ وہ ایک لمبا سا ڈھیلا ڈھالا فرغل پہنے دُنیا بھر کے

عظیم روس بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے فن میں اپنے ماحول کے خلاف بغاوت کو نئے کا جذبہ ابھرا۔ یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جس طرح ۱۸۵۷ء کے غدر کو ہم ہندستان کی آزادی کی پہلی جنگ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۳۱ء کے اس طوفان کو کشمیر کے نئے نظام کا جنم داتا سمجھ سکتے ہیں۔ اس انتشار کے جلو میں ایک کشمیری سکون تھا — جسے اسباب نے ایک حساس فن کار کو ایک باغی میں بدل دیا۔ بغاوت کا یہ جذبہ اس کے تحت الشعور میں پرورش پاتا رہا۔ اور ایک دن لاوے کی طرح ابل پڑا جو دنیا کے سبھی عظیم باغی شاید اپنے فن کا حصہ رہے تھے۔

۲ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ مونٹ بیٹن کے اعلان نے ملک کے نئے خاکے کی بات کہی۔ جنتا نے اسے سنا۔ سیاسی رہنماؤں نے اس پر غور کیا۔ سوجھ بوجھ رکھنے والوں نے اس پر لکھا۔ اور ہمالیہ کی چوٹیوں پر کھڑے کشمیری کے کانوں سے اس کی گونجیں ٹکرائیں۔ وہ چونکا۔ اس گونج میں بجلی کی کڑک اور خون کی گرمی تھی۔ اور پھر اس نے ملک کے ہر گوشے کو ٹٹولا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے خون کا ایک سیلاب انسانیت کی بستی پر چھا گیا۔ انسانیت چیخی۔ اس کا دل ہمدردی سے بھر آیا لیکن اسے ایک مبہم سے خوف کا بھی احساس ہوا۔ اور ایک بار پھر جب اس نے نگاہ اٹھائی۔ تو شعلوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ ان کے سیلاب کا رخ اپنی حسین وادیوں کی طرف مڑتے ہوئے پایا۔ اس کے افسردہ اور نڈھال چہرے پہ عزم کی گہری شکنیں تن گئیں۔ اور ایک بھوکا، ننگا اور ضعیف باغی تخریب کے طوفان سے ٹکرا گیا۔ سترہ سال سے کشمیر کو آزاد دیکھنے والا کشمیری اپنا خون دے کر آخر جیت گیا۔ اس نے کشمیر میں صدیوں سے مسلسل وارد ہوتے ہوئے حکمرانوں کے قافلوں کو یک لخت روک دیا۔ اور پھر ایک اونچی آواز گونجی:-

"کشمیری اپنا خون بہا کر للتا دتیہ اور زین العابدین کے سنہرے دور کو کشمیر میں واپس لائیں گے!"

یہ اس کے ایک مایہ ناز سپوت کی آواز تھی۔

میں نے افسانوں اور ڈراموں کی ترتیب حالات کی ترتیب کے مطابق کی ہے۔ جس کی پہلی کڑی ۲ جون ۱۹۴۷ء کا اعلان ہے۔ اور جس کی آخری کڑی فی الحال یو۔ این۔ او کے کمیشن کی آمد اور اس کی واپسی۔ خدا جانے اس زنجیر کو یہیں کاٹ دیا جائیگا۔ یا اس میں ابھی اور کڑیاں لگائی جائیں گی!!

آپ کیلئے چند کتابیں

یہ کھنڈر میرے ہیں ——— کشمیری لال ذاکر

ذاکر نے انسانی رفعت کے تاج محل کے میناروں کو گرتے دیکھا ہے اس نے انسانی ذہن کے تاریک گوشوں میں پوشیدہ گڑھوں پر نگاہ ڈالی ہے وہ نفسیات کے ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ "یہ کھنڈر میرے ہیں"۔ ذاکر کی جدید منفرد اور تلخ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت فی کاپی -/۳ روپیہ (زیر طبع)

بھلے آدمی :- مرتبہ :- پرویز۔ فسادات کے متعلق بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان کے بلند ترین افسانہ نگاروں نے انسانیت کی پسماندگی کا جن صورتوں میں تجزیہ کیا ہے "بھلے آدمی" اس کی عریاں تصویر ہے۔ اس مجموعہ میں شامل ہیں آپکے محبوب فنکار کرشن چندر، ریوتی سرن شرما پرکاش پنڈت، کشمیری لال ذاکر، پریم ناتھ در، مم راجندر، مسز سلطے خورشید منیر پرویز۔ زیر ترتیب۔ قیمت -/۳ روپیہ۔

دھڑکن :- پرویز کی وہ بلند پایہ تصنیف جس کے متعلق ناقدان کا خیال ہے کہ اردو ناول نویسی میں یہ اپنی نظیر آپ ہے قیمت -/۴/۲ روپیہ۔ دوسرا ایڈیشن (زیر طبع)

پرویز کی چند اور کتابیں

دھند	ناول	۲/-
نور و نار	"	۲/-
اس کی کہانی	"	۲/-
دھبے	افسانے	۲/۸/-

انگریزی ناولوں کے بہترین تراجم
از منشی تیرتھ رام صاحب فیروز پوری

زہری بان		۳/-
حد		۱/-
پیلا		۲/-
محلات شاہی کے	حصہ اول دوم	۸/-
چڑیا کی لگی		۳/۸/-
نازک ستار		۳/-
نولکھا ہار		۴/-
قفس زریں		۴/-
گناہ کی راہ		۲/۴/-
خونی چکر		۳/۸/-
منزل مقصود		۳/-
وطن پرست		۴/-
لال مقدس		۲/۸/-
فانچو کا انتقام		۲/۸/-
فانچو کی تلاش		۲/۱۲/-
پروانہ جانباز		۲/۸/-
زہر الخلا		۳/-
مقافات عمل		۲/۸/-
شب تاریک		۶/-
کارنامہ جات		۳/-
کارنامہ		۳/۸/-

منشی پریم چند

بیوہ	ناول	۲/۸/-
آخری تحفہ	افسانے	۳/-
نرملا	ناول	۲/۱۵/-
خاک و پروانہ	افسانے	۲/۱۵/-
دودھ کی قیمت	"	۱/۱۲/-
زاویۂ راہ	"	۳/-
واردات	"	۲/۴/-

سرت چندر چیٹرجی

زمانہ ساز	ناول	۳/-
خانماں برباد	"	۳/۸/-
ادارہ	"	۴/-

آتش

سمرقند کی دوشیزہ		۲/-

ساقی		1/4/-
فلمی پریوں کی داستان		1/4/-
غریبوں کا بہشت		1/4/-

بنگال کے تراجم

ادیب	شانتی نرائن	3/-
کملا	راجہ مہندی علیخاں	2/-
کاروانِ حیات	مینا دیوی	2/-
جنت و جہنم	"	2/-
آنسو	"	1/8/-
سلاوتی	ٹیگور	1/8/-
اندھیرے میں	"	2/-
جوکھیر والی	"	3/-
کون کسی کا	"	1/12/-
تاج	"	-/8/-
سرگوشیاں	"	-/10/-
گیتا بخلی	"	1/4/-

افسانے

نئی کروٹ	شہزادہ ایاز	1/8/-
ریحانہ	الطاف	1/-
حجاب	سعیدہ بزمی	2/-

خواب پریشاں	نشتر	1/-
انگبیں	عطاء اللہ	3/-
پردیس	"	2/4/-
شاعر کی بیوی	یکتا	1/-
ننواڑی	حاجی بغل بطورا	1/12/-
معیارِ محبت	سیاح شامی	1/8/-
شہید نفس	"	2/-
آج کل	رفعت الہ آباد	1/8/-
ٹالسٹائی کی کہانیاں	آتش	1/12/-
ارادے	زرینہ رسیٹھ	2/8/-
بیوی کی تلاش	احسان بی اے	1/12/-
ستارۂ صبح	راجہ مہندی علیخاں	1/-
سفید چمگادڑ	جمیل احمد	1/-
روشنی اور سائے	اندر کمار	1/-
کوچوان	پریم چند	1/-
نفرت	گوپال متل	1/-
موت کا راگ	مرزا ادیب	
صحرانورد کے رومان	"	
دنیائے آرزو		
اشکِ شرر	کوثر چاندپوری	1/-
قمر	خواجہ محمد شفیع	-
آنچل	احمد ندیم قاسمی	-/12/-

مختاراتِ نیاز	نیاز فتحپوری	3/8/-
شرابی	اسلم	2/8/-
کوشلیا	"	1/4/-
گل فرنگ	"	2/8/-
دنیائے تبسم	شوکت تھانوی	2/8/-
انقلاب افغانستان	صادق صدیقی	5/8/-
جے ہند	(نظمیں) خان کابلی	1/4/-
گونج	" کیف عرفانی	1/8/-
کسان مزدور		-/9/-
اگست گڑبڑ	چمن لال آزاد	5/-
باغی جواہر	"	4/-
خیالات گاندھی	نرمل چندر	2/-
میری ڈائری	وجے لکشمی پنڈت	1/8/-
انقلابی اگلکلے		1/8/-
انقلاب زندہ باد	پرنسپل چھبیل داس	1/8/-
انسانی رائیں	"	1/-
آج کی دنیا	"	3/8/-
اور بنسری بجتی رہی	دیوندر ستیارتھی	3/-

نظر بند	ترجمہ پرنسپل چھبیلداس	11/8/-
چنگاریاں		1/8/-
سوشلزم		1/8/-
شیردل ارونا		1/8/-
چنگ و رباب	پروفیسر کنہیا لال کپور	
نجمن	پریم چند	5/-
پردۂ مجاز	"	6/-
خوابِ خیال	"	2/8/-
کربلا ناٹک	"	2/8/-

فطرت نگار سدرشن

زہریلا آبحیات	2/4/-
خوش انجام	-/8/-
قدرت کے کھیل	1/6/-

مہاتما گاندھی

شاہراہ تندرستی	1/8/-
اصول ضبط	1/8/-